نئی تہذیب۔ نئی تعلیم

حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی

نئی تہذیب: نئی تعلیم

ترجمہ

از

برکت علی فراقؔ (بی، اے جامعہ)

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

اشاعت اول ۱۱۰۰

قیمت

دلی پرنٹنگ
نومبر ۱۹۴۵ء

فہرست

انتساب

بخدمت جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مدظلہ شیخ الجامعہ

(جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)

استاذ محترم

آپ نے ایک مرتبہ دہلی کے ٹاؤن ہال میں کسی تعلیمی مسئلے پر ایک تقریر فرمائی تھی۔ الفاظ تو مجھے یاد نہیں مگر مفہوم بالکل یہ تھا کہ:۔
"آج کے بچے مستقبل کے صرف شہری ہی نہیں ہیں بلکہ ممکن ہے ان میں کوئی ولی بھی ہو اور کوئی مفکر جو دنیا کا رنگ بدل دے اس لئے ان سے اپنا ادب کرانے سے زیادہ ہمیں اُن کا ادب کرنا چاہیئے۔"

اس بات سے میں نے کچھ سیکھا، کچھ سیکھ رہا ہوں اور ابھی اور سیکھوں گا۔ اس کتاب میں بھی میں نے اسی بات کو محسوس کیا اس لئے میری خواہش ہے کہ اس کے ترجمے کو جسے میں نے بڑے شوق سے کیا ہے آپ کے نام سے منسوب کر دوں۔

آپ کا شاگرد

برکت علی فراق

عرض

زیرِ نظر کتاب امریکہ کے ماہرِ تعلیم ولیم۔ایچ کلپیٹرک کی تصنیف :-

EDUCATION FOR A CHANGING CIVILIZATION

کا ترجمہ ہے۔ ترجمے کی محرک اس کی اشاعت نہ تھی بلکہ مجھے کتاب اچھی لگی تھی، میں نے اس کا ترجمہ شروع کردیا۔ مگر دو ابواب کا ترجمہ ہو پایا تھا کہ شوق تقریباً ختم ہوگیا اور کتاب ناتمام رہ گئی

اسی اثنار میں میرے محترم دوست مولوی بدرالحسن صاحب نے مجھے حکم دیا کہ کتاب مکمل کردو۔ مجھے اب کتاب کے اشاعت کے خیال نے اکسایا اور خدا خدا کرکے میں نے پورا کرلیا۔

حالی پبلشنگ ہاؤس نے اپنی مطبوعات کا ایک پروگرام بنایا ہے جس میں تعلیمی کتابوں کا ایک سلسلہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

آخر میں اپنے محترم استاد جناب سعید انصاری صاحب کا ممنون ہوں کہ آپ نے کتاب کا تعارف لکھ کر میری حوصلہ افزائی فرمائی اور اپنے محترم دوست جناب بدرالحسن صاحب کا شکر گذار کہ موصوف نے خفا ہو ہو کر مجھ سے ترجمہ مکمل کرایا اور مجھے موقع بخشا کہ چند اور تعلیمی کتابوں کا ترجمہ کرنے کا حوصلہ کروں۔

مترجم

تعارف

اس کتاب کے مترجم میرے عزیز دوست برکت علی صاحب فراق کی فرمائش ہے کہ اس کے تعارف میں میں چند سطریں لکھ دوں۔ ان کی یہ فرمائش شاید اس بنا پر صحیح ہو کہ مجھے صاحب تصنیف کے تلمیذ ہونے اور اُن کے خیالات و افکار کے براہ راست ان کی زبان سے سننے اور سمجھنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ لیکن معلوم نہیں میں اس سلسلے میں اس حق کو صحیح طور پر ادا بھی کر سکوں گا یا نہیں؟

پروفیسر ولیم۔ ایچ۔ کلپیٹرک ہندوستان میں کسی خاص تعارف کے محتاج نہیں۔ منصوبی طریقۂ تعلیم کے ساتھ پروفیسر کلپیٹرک کا نام ذہن میں آجانا ایک لازم و ملزوم سی چیز ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان میں اس سے نہ تو ان کا صحیح تعارف ہوا ہے اور نہ اُن کے طریقہ تعلیم کا۔ منصوبی طریقۂ تعلیم پڑھانے کے ایک آسان گُر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور پروفیسر کلپیٹرک اس کے موجد، حالانکہ یہ ایک گُر نہیں، ایک فلسفۂ تعلیم ہے اور پروفیسر کلپیٹرک اس فلسفے کے مفسر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کی آنکھیں انقلابات اور تبدیلیوں کی اس نئی زندگی میں "نئی تعلیم" کی یہ تصویر دیکھ رہی ہیں۔ دنیا کی ہر چیز میں ایک تبدیلی نمایاں ہے کوئی چیز آج وہ نہیں جو کل

تھی۔ ذرائع آمد و رفت، کسب معاش کے وسائل، رہن سہن کے طور طریقے، جماعتوں اور قوموں کے باہمی تعلقات، غرض کیا معیشت، کیا سیاست کیا تعلیم کیا تمدن، ساری انسانی تہذیب ایک انقلاب کے دور سے گذر رہی ہے۔ ایسی صورت میں ہماری تعلیم کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیا سکھائیں اور کس طریقے پر سکھائیں؟ پروفیسر کلپیٹرک سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے تعلیمی اعتبار سے اس تبدیلی کو محسوس کیا اور اپنی اس مختصر سی کتاب میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ تغیر آیا با معنی ہے یا بے معنی، اس کا جواب علم حیاتیات (بیالوجی) سے پوچھیے۔ غلّہ کے ایک دانے یا درخت کے ایک بیج میں یہ تغیر پسندی ایک مخصوص مقصد کے ماتحت ہوتی ہے۔ درخت کا بیج زمین سے پھوٹتا ہے، بڑھتا ہے اور بڑھ کر ایک عظیم الشان درخت ہو جاتا ہے، لیکن وہ ہوتا وہی ہے جس کے ہونے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے۔

اس تغیر پسندی کا سب سے بڑا مطالبہ تعلیمی اعتبار سے ہمارے نصاب پر ہے جو عموماً روایتی اور ایک پرانے ڈھرے پر چلا جا رہا ہے۔ اس کے مواد کا زمانۂ حال کی تبدیلیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زندگی ایک نئے راستے پر لگ گئی ہے اور ہمارا نصاب اپنی اُسی پرانی ڈگر پر چلا جا رہا ہے۔

دوسرا بڑا مطالبہ مدرسے کے ماحول اور طریقہ تعلیم پر ہے۔ اب تک بچے استاد کے زیر حکومت رہتے چلے آئے ہیں۔ وہ ایک حکم اور فیصلے کے پابند رہنے کے عادی رہے ہیں خواہ وہ استاد کا ہو، دستور اور

رواج کا ہو، یا دین اور ملت کا ہو، بہرحال ان کا سرچشمہ ان کی ذات سے خارج میں ہوتا ہے۔

لیکن اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے بچے موجودہ تمدنی مسائل سے واقف ہوں، وہ مسائل جو اس وقت ہماری تہذیب کے سامنے ہیں اور جو آئندہ اس سے شدت کے ساتھ پیش آنے والے ہیں۔ وہ مسائل اس طرح بچوں کے سامنے پیش کئے جائیں جیسے کوئی حل شدہ کلیے ہوتے ہیں، بلکہ انھیں حل کرنے کے طریقے بھی بتائے جائیں۔

اس بنا پر مدرسے کے نظام اور اس کے طریقہ کار میں از سر نو تنظیم کی ضرورت ہے۔ مدرسے کا نصاب اور طریقۂ تعلیم دونوں ایک حرکت پسند بنیاد پر ہونے چاہئیں۔ ہماری روزمرہ کی ترقیوں اور تبدیلیوں کا تقاضا ہے کہ ہمارے بچے تمام سماجی اور تمدنی معاملات میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں نیز جمہوریت کا اقتضا ہے کہ شخصیت کا احترام کیا جائے اور عام مفاد کے لئے باہمی اشتراک عمل اور تعاون سے کام لیا جائے۔

اس بنیاد پر جس قسم کے مدرسے کی ہمیں ضرورت ہے اس کی تین بڑی خصوصیتیں ہونی چاہئیں :-

(۱) یہ ایک ایسا مدرسہ ہونا چاہیے جس کا تعلق روز مرّہ کی زندگی سے ہو اور جہاں بچوں کو نت نئے تجربات کا موقع ملے۔

(۲) اس مدرسے میں بچے فعّالیت پسند ہوں اور وہ کسی بامقصد کام کے ذریعے سیکھنے کے عادی ہوں۔

(۳) اس مدرسے کے اساتذہ ایسے ہوں جو بچوں کے ساتھ ہمدردی اور اُن کے کاموں میں دلچسپی رکھتے ہوں۔

ان خصوصیات کے تحت بچے جو کام بھی ہاتھ میں لیں گے وہ ایک منصوبہ کی حیثیت رکھے گا، یعنی سب سے پہلے بچے اس کام کی ضرورت محسوس کریں گے۔ پھر اس کام کے کرنے کا ارادہ کریں گے۔ پھر سب مل کر اس کام کو انجام تک پہنچائیں گے ——————————— اور آخر میں اُس پر تبصرہ کریں گے کہ وہ کہاں تک اپنے مقصد میں پورے ہوئے۔

یہ ہے اس 'نئی تہذیب' میں 'نئی تعلیم' کا خاکہ جسے پروفیسر کلپیٹرک نے اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے اور جسے ہمارے لائق مترجم نے اردو خواں طبقے کے لئے اس ترجمے کے ذریعے ممکن بنا دیا ہے۔ لائق مترجم چونکہ خود بھی تعلیم کا عملی تجربہ رکھتے ہیں اس لئے ان مسائل کے سمجھنے اور ایک تجربہ کار مترجم کی حیثیت سے پیش کرنے میں وہ پورے طور سے کامیاب ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب تمدنی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں میں عام طور پر اور تعلیمی حلقوں میں خصوصیت کے ساتھ بہت مقبول ہوگی۔

سعید انصاری بی اے (جامعہ)
ایم۔ اے۔ پی۔ ڈی۔ (کولمبیا)
پرنسپل ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ
(جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)

دیباچہ

دنیا کی ہر چیز میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ یہ بات ہر شخص تسلیم کرتا ہے مگر اس تبدیلی کا رخ کس طرف کو ہے، اس باب میں مختلف خیالات ہیں۔ یہ صورت حال اس قدر پیچیدہ ہے کہ اگر چاہے تو طبیعت کی ہر افتاد دنیا کی گوناگوں تبدیلیوں میں سے چند مثالیں لے لے اور اسی پر زمانے کے رُخ کا حکم لگا دے۔ چنانچہ ذہن کی اسی افتاد کے ماتحت کچھ لوگ نئی ایجادات کی حیرت انگیز فہرست، مشینی دولت آفرینی کی وسعت آبادی کی کثرت اور دولت کی فراوانی کو ثبوت میں پیش کر کے کہتے ہیں کہ یہ عالمگیر ترقی ایک ناگزیر حقیقت ہے جو تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ ایک دوسرا گروہ جس میں غالباً اول الذکر مذہب کے بھی کچھ مختلف الطبع لوگ شامل ہیں، انہی مثالوں کو پیش نظر رکھ کر ماتم کرتا ہے کہ دنیا جرائم کا اکھاڑہ بن گئی ہے جس میں نئی پود خاص طور پر شامل ہے۔ کچھ لوگ جن کی نظریں نسبتاً زیادہ دوربیں ہیں، کہتے ہیں کہ تاریخ تو اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ بڑے ہمیشہ چھوٹوں کی خامیوں کے شاکی رہے ہیں، ورنہ اصلیت یہ ہے کہ یہ زمانہ گذشتہ زمانوں سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جب پیچیدگیوں کا یہ

عالم ہو تو ظاہر ہے دماغ پریشان ہو جاتا ہے، اور جاہتا ہے کہ کوئی راہ نکلے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کرے تو کیا کرے۔

اور یہی نہیں کہ ان تبدیلیوں کی نوعیت میں اختلاف ہے، بلکہ اس سے زیادہ اختلاف اس باب میں ہے کہ ان سے عہدہ برا ہونے کی کیا صورت ہے۔ فکر کے ہر میدان میں، وہ قدیم ہو یا جدید، اس مسئلے کے حل کی تلاش کی جاتی ہے۔ مذہب، سائنس، سیاست، معاشیات، تعلیم، غرض باری باری سے ہر ایک سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ شکر ہے کہ مسئلے کے کم سے کم ایک پہلو پر اتفاق ہو گیا ہے کہ اس باب میں تعلیم سے کام لیا جائے، اس لئے کہ موجودہ نسل سے تو ممکن نہیں ہے، البتہ جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ آنے والی نسلوں کے ہاتھوں ہو گا۔ مگر کس قسم کی تعلیم؟ پھر وہی اختلاف کی مصیبت!

یہ ہے وہ نازک مسئلہ جس پر اس کتاب میں غور و بحث کی کوشش کی گئی ہے۔ پورے مسئلے پر نہیں، اس کے صرف ایک معمولی سے پہلو پر۔ اس کتاب کا کام بہت آسان ہے اور مضمون کا خاکہ نہایت مختصر یعنی زمانہ بدل رہا ہے اور بعض حیثیتوں سے اتنی تیزی سے بدل رہا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں بدلا تھا۔ یہ تبدیلیاں تعلیم کے سامنے نئے نئے مطالبے پیش کر رہی ہیں۔ ہمارے تعلیمی نظام میں بہت بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ وہ نئے حالات سے عہدہ برا ہو سکے، یہی تین مسائل اس کتاب کے موضوع ہیں جن پر اس کے تین ابواب میں یکے بعد دیگرے بحث کی گئی ہے۔

باب اوّل

باب اوّل

ہماری بدلتی ہوئی تہذیب کی ہیئت

بدلا ہوا زمانہ

زمانہ بدل رہا ہے۔ ہمیں اس تبدیلی کا رُخ دیکھنا ہے۔ دنیا لاتعداد تبدیلیوں سے گذر رہی ہے۔ ان میں سے بعض رجحانات اتنے صاف اور صریح ہیں کہ کم سی کم آج کل وہ بالکل قطعی اور یقینی معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ذرائع رسل ورسائل ہیں کہ روز بروز ترقی کر رہے ہیں چند نسلوں سے ان کی ترقی کی رفتار ہی میں نہیں، ان کی میں بھی اضافہ ہوا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ تبدیلی کے اس رُخ کے کم سے کم

دوسرے پہلو کی ترقی ابھی جاری رہے گی۔ پھر دولت آفرینی کا میدان ہے۔ یہ پہلے ایک شخص کے ہاتھ اور دماغ کے تابع تھا۔ اس پر روز بروز مشین کا تسلط بڑھتا جا رہا ہے یہ رجحان بھی جب تک تمام دنیا میں نہیں پھیل جاتا، اس وقت تک یقیناً بڑھتا رہے گا، اور ممکن ہے اس اثنا میں اس میں تنوع بھی پیدا ہوتا رہے۔ جنگ روز بروز ہمہ گیر ہوتی جا رہی ہے۔ اور بعض صورتوں میں اس کی ہلاکت آفرینی وسیع۔ اس کی ہمہ گیری اور ہلاکت خیزی کے پیش نظر بڑے بڑے مفکرین کو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ اگر دوسری مرتبہ جنگ ہوئی تو ہماری تہذیب ہی کا خاتمہ ہے۔ آخری مثال سے ظاہر ہے کہ جو رجحانات بالکل صاف اور امر واقعہ ہیں، ان سے قطع نظر ہم دوسرے رجحانات کی تعیّن میں ایک دوسرے سے متفق نہیں ہوتے۔ ایک جس چیز کو رجحان سے تعبیر کرتا ہے، دوسرا اُس کی تردید کر دیتا ہے۔ ایک رجحان کے متعلق ایک شخص اگر کہتا ہے کہ جاری رہے گا تو دوسرا کہتا ہے قطعاً نہیں۔ جب صورت حال اس قدر مختلف ہو تو کسی ہمہ گیر رجحان کی تحقیق و جستجو کی اُمید ہو تو کیونکر ہو؟

خوش قسمتی سے ہمارا کام نسبتاً کم مشکل اور اختلافات کی حدود سے کسی قدر الگ ہے اور کم سے کم مسئلے کے اوّل الذکر پہلو کا تو یہی حال ہے۔ یہاں صرف ان مسائل کے تجزیہ و تحقیق کی کوشش کی گئی ہے، جو سب کی نظر میں ہیں۔ البتہ اگر زیادہ باریک بینی اور جزرسی سے کام لیا جائے تو ممکن ہے ہمیں زیادہ پختہ اور ہمہ گیر رجحانات دکھائی دے جائیں۔ اگر ایسا ہو سکے تو وہ ہمارے غور و فکر کے مستحق ہو جائیں گے اور ہم انھیں نظر انداز نہ کر سکیں گے۔ اگر ہم انھیں معلوم کر لیں تو وہ کسی بھی تعلیمی پروگرام کی بنیادی شرط بن سکتے ہیں اور وہ پروگرام ہماری تائید کا بجا طور پر مطالبہ کر سکے گا۔

پھر ہم اپنی تحقیق کہاں سے شروع کریں؟ لفظ "جدید" آج کل ہمارا تکیہ کلام بنا ہوا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا اس کی کوئی اصلیت ہے؟ کیا واقعی کوئی ایسا محرک ہے جو جدید دنیا کو قدیم یا دورِ وسطیٰ کی دنیا سے ممتاز کرتا ہے؟ صاف جواب ہے اور ایک حد تک قطعی بھی۔

تاریخ عالم کی چھان بین سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید دنیا کی تشریح کرنے والا ایک واقعہ ہے اور یہی واقعہ جدید دنیا کو بہت بڑی حد تک قدیم یا دورِ وسطیٰ کی دنیا سے نہیں تو ماضی قریب سے کم سے کم ضرور ممتاز کرتا ہے۔ یہ واقعہ ہے۔ آزمودہ خیال کے ارتقا کا، بالفاظ مختصر جدید سائنس کا اور انسان کے معمولات میں اس کے نفاذ کا۔ جدید سائنس اپنے تجربہ طلب تخیل کے اصول کی شکل میں ہمارے سامنے ایک ایسا واقعہ پیش کرتی ہے جو اس سوال کا کہ موجودہ دنیا کیوں اور کس طرح اپنی الگ ایک خصوصیت رکھتی ہے ایک مابہ الامتیاز جواب ہے۔

آزمودہ خیال ہمارے بدلتے ہوئے دور کی وجہ امتیاز ہے

آزمودہ خیال، ایک بالکل نئی ترکیب! اس سے مراد کیا ہے؟ اس کا جواب گلیلیو کے ہاں ملے گا، یہی وہ شخص تھا جس نے ۱۵۹۰ء میں پیسا کے ٹیڑھے مینار سے ایک ڈرامائی انداز میں دو مختلف وزن کی دو گیندیں نیچے گرائیں اور دنیا کے سامنے یہ جدید طریق فکر پیش کیا۔ ارسطو کی تعلیم یہ تھی کہ اگر کسی بلندی سے دو گیندیں ایک پانچ پاؤنڈ وزنی اور ایک پونڈ وزنی ایک ساتھ نیچے گرائی جائیں تو پانچ پونڈ والی گیند چونکہ ایک پونڈ والی گیند سے پانچ گنی زیادہ وزنی ہے، لہٰذا وہ اس سے پانچ گنی تیزی کے ساتھ نیچے گرے گی۔ یہ بات اتنی قدرتی، اتنی قطعی اور معقول اور معمولی سمجھ بوجھ کے مطابق معلوم ہوتی تھی کہ انیس سو سال تک کسی کو اس میں شک کرنے کا خیال تک نہ گذرا چہ جائیکہ اسے آزما کر دیکھنا۔ سوال و جواب اور بحث و تمحیص کا دستور۔ قدیم زمانے میں بھی کم عام نہیں تھا مگر علماء کے حلقے میں جب کوئی مختلف فیہ مسئلہ اٹھتا تھا تو اس کی صحت و سقم کا تصفیہ تجربے سے نہیں بلکہ استدلال یا استناد کے ذریعے ہوتا تھا۔

آیئے اس مسئلے کو ذرا اور صاف کرلیں۔ قدیم اور درمیانی دونوں زمانوں کے علما کو اگر کوئی امتیاز حاصل تھا تو یہ کہ منطق اور علم کلام کے ماہر کی حیثیت سے وہ علماء دور جدید کی بہ نسبت زیادہ باریک بیں اور نکتہ شناس تھے۔ اس بات کا امکان ہی نہیں یقین ہے کہ قرون وسطیٰ کے لوگوں خاص طور پر معلموں اور استادوں نے منطق میں اتنی ترقی اور اس کے استعمال میں اتنی مہارت پیدا کرلی تھی کہ جتنی دور رس اور مدلل بحث وہ کرسکتے تھے، آج کل کے مفکرین نہیں کرسکتے۔ اگر آج موجودہ دنیا کو

فوقیت حاصل ہے تو اس کا سبب علم کلام کی نوعیت نہیں بلکہ وہ اصول ہے جو گلیلیو نے پیش کیا تھا۔ یعنی کوئی خیال ہو، اسے تسلیم کرنے سے پہلے مشاہدہ اور نتائج کی روشنی میں اسے پرکھ لینا ضروری ہے۔

ذرا اس منظر کا تصور کیجئے۔ ارسطو کی سند معرض بحث میں ہے۔ اور مناظرہ جاری ہے۔ گلیلیو نے پیسا کی یونیورسٹی کو اپنے تجربے کی شہادت کے لیے مدعو کیا ہے۔ ٹیڑھا مینار اس وقت دونوں کام انجام دے رہا ہے۔ تجربہ گاہ کا بھی اور مظاہرے کے ہال کا بھی تاکہ سب لوگ آسانی سے دیکھ سکیں۔ دونوں گیندیں تولی جاتی ہیں اور اونچائی سے ایک ساتھ گرادی جاتی ہیں۔ اور ارسطو کے تصور کے عین برعکس دونوں ایک ہی ساتھ گرتی ہیں۔ طبیعات میں ایک نئے قانون کا مظاہرہ اور اس سے بڑھ کر منطق میں ایک نئے طریق فکر کا آغاز ہوتا ہے۔ جو لوگ جانتے ہیں کہ منطق میں اس انحراف کی بدولت کیا کچھ نتائج رونما ہوئے، یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اس وقت اس مظاہرے کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ ہوائٹ ہیڈ اپنے اس قول میں بالکل حق بجانب ہے کہ "حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے وقت سے اب تک ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اتنے انقلاب آفریں واقعے کا اثر اتنا خفیف ہوا ہو"۔ جہاں تک طبیعات کا تعلق ہے لوگ عام طور پر مطمئن تھے، اگرچہ چند بوڑھے اب بھی شک میں پڑے رہے، مگر معلوم ہوتا ہے منطقی طریق فکر میں اس انحراف پر کچھ زیادہ بحث نہیں ہوئی۔ یہی وہ انحرافِ اصول ہے: مفروضات کو نظری مباحثوں اور مناظروں کے ذریعے طے کرنے کی بجائے مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھنے کے اصول کا آغاز، جسے یہاں جدید دنیا کی تعمیر کے لئے ایک کلید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

نظریات کو عینی حقیقت کے معیار پر پرکھنے کا اصول جدید الخیال طبقے کے نزدیک اس قدر معقول اور مسلّم معلوم ہوتا ہے کہ اسی ذہن میں ہم اس کے بعض بنیادی مفہوموں سے قطع نظر کر لیتے ہیں اور بعد کو پچھتاتے ہیں کہ یہ باتیں پہلے ہی کیوں سمجھ میں نہیں آئیں اور ہم نے انھیں بر وقت کیوں نہ تسلیم کر لیا۔ افلاطون سے بھی پہلے بہت سے لوگوں کے نزدیک خیال اور دماغ کو احساس اور مادّے پر فضیلت حاصل تھی۔ اس نظریے نے مسیحی پیشواؤں کے دلوں میں جگہ حاصل کر لی تھی اور انھوں نے اسی کی روشنی میں مادّے پر روح کی اخلاقی فضیلت کے اصول کو مرتب کیا تھا۔ ان نوع بہ نوع خیالات کے پیش نظر گیلیلو کا تجربہ ایک انقلابانہ جرأت تھی کہ اس نے خیال اور دماغ جیسے بزرگ و برتر کی اصلاح کے لئے احساس اور مادہ جیسے حقیر اور کمتر کی خدمات حاصل کیں۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی اصول اور قوانین بہت دور رس ہوتے ہیں اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ وہ بہت دیر میں اخذ کئے جاتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ دیر میں تسلیم کئے جاتے ہیں۔

صحیح اور اعتبار کے قابل خیالات کے خزانے کی طرف صرف آزمودہ خیال کے تسلیم کرنے سے رہنمائی ہوتی ہے۔ "کائنات" جہاں تک ہمارے علم کی رسائی کا تعلق ہے "یک رنگ" ہے یعنی مماثل حالات ہمیشہ مماثل نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر یہ بات لازم آتی ہے کہ اگر کسی خیال کا تجربہ کسی ایک انداز پر معقول طور پر کر لیا جائے تو اس کا ہمیشہ وہی انداز قائم رہے گا اور وہی نتیجہ مرتب ہوگا واقعہ یہ ہے کہ ہم کسی آخری اور قطعی تجربے کا علم نہیں رکھتے

لیکن اگر تجربے کی حدود اور شرائط مقرر کر دی جائیں تو ممکن ہے وہ

اس قدر صحیح اور مکمل ہو کہ ان مقررہ حدود کے اندر معتبر نتائج دستیاب ہو جائیں۔
علم کیمیا کو دیکھیے۔ اس کے اصول بدلتے رہتے ہیں مگر اس کے آزمودہ نتائج جوں کے توں معتبر رہتے ہیں۔ ایک نسل پہلے ماہرین کیمیا جوہر کو جیسا کہ اس کے معنی سے ظاہر ہی، آخری مادی عنصر سمجھتے تھے جس سے دوسرے تمام عناصر ترکیب پاتے ہیں۔ یہی وہ تصور تھا اور ایک حد تک صحیح تصور تھا جس کی بنیاد پر علم کیمیا کی ساری عمارت کھڑی کی گئی تھی۔ مگر اب ہمارا عقیدہ یہ ہی کہ جوہر اپنے سے بھی چھوٹے برق پاروں کی ترکیب سے مرکب ہی اور وہ ایک نظام کے ماتحت گردش کرتا رہتا ہی جو کم و بیش ہمارے نظام شمسی سے مشابہ ہی۔ مگر کیا جوہری نظریے کی تنسیخ سے علم کیمیا کی بھی تنسیخ ہو گئی؟ ذرہ برابر بھی نہیں۔ بعض نظریات میں ترمیم ضرور ہوگی اور مستقبل میں علم کیمیا بھی اپنے نئے نقطۂ نظر کے ماتحت مختلف ہوگا۔ مگر قدیم کیمیا جو نہایت صبر آزما مراحل طے کرنے کے بعد قائم کی گئی تھی، باقی رہے گی۔ جن حدود کے اندر اس کے تجربے اس کامیابی کے ساتھ پرانی بنیادوں پر کیے گئے تھے، وہ ان حدود کے اندر اب بھی صحیح ہیں۔ جوہر ہو یا اور کچھ۔ مفصل تجربے کے بعد پہلے جو نتائج بھی اخذ کیے گئے تھے، وہ اُن حدود کے اندر اب بھی صحیح ثابت ہوں گے، گندھک کا تیزاب ہم اب بھی اسی طرح تیار کرتے ہیں جیسے پہلے کرتے تھے، تجربہ شرط ہے، اور اس سے ایک مقررہ حدود کے اندر جو نتیجے پہلے معتبر ثابت ہوئے تھے، وہ ان حدود کے اندر اب بھی معتبر ہی رہیں گے۔ اس طرح نظریات کو پرکھنے کا اصول جو گلیلیو نے قائم کیا تھا، آزمودہ خیال کے ایک مسلسل ذخیرے کا سبب بنتا ہی۔

مگر جدید دنیا کی تشکیل میں محض معتبر خیال ہی کو دخل نہیں ہی، بلکہ اس کے ساتھ

ساتھ یہ رجحان بھی جدید دنیا کی تخلیق میں کارفرما رہا ہے کہ ان خیالات کو انسانی زندگی کے ارتقا کی غرض سے برتا بھی جائے۔ یہ دستور ہمیشہ نہیں رہا ہے۔ یونان میں اسے نہ کوئی اہمیت حاصل تھی نہ اس کی کبھی کوشش کی جاتی تھی۔ مگر اب یہ حال ہے کہ اس رجحان نے جنون کی صورت اختیار کر لی ہے، حتیٰ کہ بعض حلقوں میں اسے ایک حد تک معیوب سمجھا جانے لگا ہے۔ مگر ہمیں یہاں اس کے کیف وکم سے بحث نہیں ہم کو تو صرف واقعات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ علمی تحقیقاتوں اور ایجادوں میں باہم پیر و مرید کا سا تعلق ہے۔ اب بجلی ہی کو دیکھئے، سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس کے استعمال کی .... ۵ مختلف النوع صورتیں رائج ہیں۔ تعداد خواہ کچھ ہی ہو، مثال اپنی جگہ واضح ہے۔ آزمودہ خیال اور انسانی زندگی پر اس کا استعمال گویا ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بدولت جدید دنیا "جدید" کے لقب سے ملقب ہوئی ہے۔

یہ روز بروز بڑھنے والا مجموعہ ایک لامتناہی اندوختہ ہے جہاں سے انسان کے نئے عملی مسائل کے لئے نہایت کارآمد اور مفید نسخے ہاتھ آتے ہیں۔ مگر اس کی حیثیت یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اسے اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ اس کے اثر سے انسان اپنی ذات اور عام زندگی کے متعلق اپنا طرز عمل بدلنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یہ حقائق جن پر تفصیلی بحث ہم آگے چل کر کریں گے، ان بہت سے راستوں میں سے دو راستے ہیں جن پر چل کر معتبر خیال کے اس مجموعے نے موجودہ دنیا کی بنیادی سیرت کی تخلیق کی ہے۔

جدید دنیا کی تخلیق میں چھاپہ خانے نے آزمودہ خیال کے حلیف کی حیثیت سے

کام کیا ہے۔ اس موقع پر اس کے متعلق بھی چند الفاظ بے محل نہ ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ چھاپہ خانے کا استعمال گلیلو کے زمانے میں بھی ہوتا تھا اور آج کی طرح اس زمانے میں بھی اس کا کام خیالات کی تبلیغ و اشاعت تھی۔ خواہ وہ آزمودہ تھے، یا غیر آزمودہ۔ یہ بھی صحیح ہے کہ طباعت قدرتی طور پر عالمگیر تعلیم کی طرف لیجاتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے ذریعے کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے، مگر سائنس کے بے شمار وسائل کی بدولت ان دونوں پہلوؤں میں بھی غیر معمولی ترقی ہوگئی ہے اور خود طباعت کا اثر و رسوخ جدید ترین برقی مشینوں اور ذرائع نقل و حمل کی بدولت امید سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ خیالات کی نشر و اشاعت میں طباعت کے علاوہ جو اور جدید ذرائع ہمیں میسر آسکتے ہیں، ان کی جستجو ہم بعد میں کریں گے، طباعت کے دوش بدوش ریڈیو اور طرح طرح کی تصویریں بھی میسر آتی ہیں، جن کے اثر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا خیالات کی نشر و اشاعت کا ایک بڑا ذریعہ تعلیم ہے۔ یہ بھی پہلے کبھی اتنی ممکن الحصول نہ تھی جتنا دولت کی موجودہ افزونی نے اسے اب بنا دیا ہے اور اسی نسبت سے معتبر اور کارآمد علوم کی کثرت کے پیش نظر اس کی طلب بھی اتنی شدید ہوگئی ہے کہ تاریخ میں اسکی مثال نہیں ملتی۔

غرض جس پہلو سے بھی دیکھئے، آزمودہ خیال کو جدید دنیا کی امتیازی حیثیت قائم کرنے میں جو اہمیت حاصل ہے، اس کا نئے سے نیا ثبوت موجود ہے۔ ممکن ہے کہ یہ امتیاز نوعیت کا اتنا نہ ہو جتنا درجے کا ہے۔ غالباً ہر امتیاز کے متعلق تجزیہ و تحقیق کے بعد یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ نوعیت کا اتنا نہیں ہے جتنا درجے کا ہے۔ اس نظرئے کی حقیقت جو کچھ بھی ہو، اتنا بہر حال سطے ہے کہ آزمودہ خیال کا وعدہ اگر اس امر سے اندر

اتنی گنجائش رکھتا ہے کہ اس کا مزید مطالعہ ہمارے لئے جائز و برحق ہو جاتا ہے۔ اس مقدمے کو تسلیم کر لینے کے بعد اب آیئے دیکھیں اس اثر نے کیا کیا رجحانات پیدا کئے ہیں۔

حیات جدید کے رجحانات

حیات جدید کا مطالعہ ہمارے سامنے تین نہایت دور رس رجحانات کا خاکہ پیش کرتا ہے ـــــــ بدلی ہوئی ذہنی افتاد "صنعیت" اور جمہوریت۔ ان پر ایک پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ـــــــ اگر تمام و کمال نہیں تو بہت بڑی حد تک ـــــــ اسی آزمودہ خیال کی پیداواریں ہیں جس پر ہم اب تک بحث کرتے آئے ہیں۔ بعض حیثیتوں سے انہیں اس کے مختلف مظاہر کہئے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ یہ اگر اس کی پیداواریں نہیں ہیں تو کم سے کم اس کے اثر سے بہت بڑی حد تک بدل ضرور گئے ہیں۔ یہ تو ان رجحانات کی نوعی بحث کا پہلو ہے۔ ان کا ایک اور پہلو بھی ہے اور اس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ رجحانات جدید تعلیم کے سامنے نہایت واضح اور صریح مطالبات پیش کرتے ہیں۔

ان مطالبات پر ہم دوسرے باب میں بحث کریں گے۔ سردست ہماری گفتگو کا دوسرا موضوع ان رجحانات کا آزمودہ خیال کے ارتقا سے تعلق ہوگا۔

بدلی ہوئی ذہنی اُفتاد

زندگی میں ہر طرف ذہنی افتاد کی ایک بدلی ہوئی شکل نظر آتی ہے، اگرچہ شاید ہم یہ نہ واضح کر سکیں کہ یہ تبدیلی ہو گیا۔ قدیم مطمح نظر نے جو مغربی عیسائیت کے دونوں جلیل القدر مذاہب میں یکساں رائج تھا انسان کی فطری صلاحیتوں کو ناقابل اعتبار اور اس کے فکر کو غیر معتبر قرار دیا تھا۔ وہ بغیر کسی خارجی امداد کے کسی معتبر نتیجے پر پہنچنا محال سمجھتا تھا، اور اگر بالفرض اسے وہ خارجی امداد مل جاتی تھی تو وہ آزمائش اور تجربے کی زحمت گوارا کیے بغیر مستند سے مستند نظام قائم کر سکتا تھا اور جمہور کا فرض ہو جاتا تھا کہ وہ اس نظام یا قانون کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں گویا مستند عقیدے یا اصول کا ماخذ اگر تھا تو انسان کی ذات میں نہیں بلکہ کہیں خارج میں تھا۔ اگر کبھی وہ خود کچھ کرنے کی جرات بھی کرتا تو کم سے کم فکر کے معاملے میں بلا پس و پیش اس کے اوپر تشکیک و ارتداد کا فتویٰ صادر ہو جاتا تھا۔ غرض انسان اس قابل نہ تھا کہ خیر کا اس کے عمل تو کیا خیال میں بھی گزر ہو سکے۔

مگر شاید اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس زمانے میں لاادریت کا فلسفہ فنا ہو چکا ہے۔ یوں تو ہمارے سامنے آئے دن بعض ایسے واقعات آتے رہتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا اب بھی وجود باقی ہے، مگر فکر کے باب میں ایک بالکل مختلف طرز عمل نظر آتا ہے۔ اس حلقے میں اب یہ عقیدہ قائم ہو گیا ہے کہ انسان میں نہ صرف سوچنے ہی کی طاقت موجود ہے بلکہ اس کے اندر یہ صلاحیت بھی ہے

کہ وہ اپنے نتیجۂ فکر کو مقررہ حدود کے اندر آزما کر صحیح اور معتبر ثابت بھی کر سکے سائنٹفک منہاج نے افکار کی صحت کے معاملے میں ایک نئے قسم کا جذبہ بھی پیدا کر دیا ہے۔ کامیابی کی اس اطمینان بخش منزل پر پہنچ کر جدید الخیال مفکر جوہری نظریٔ کی تنسیخ اور قانونِ نیوٹن کی تردید کو بڑے اطمینان اور فخر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس کے نزدیک کسی آزمودہ خیال یا نظریے کی شکست دراصل اس کی شکست نہیں بلکہ ناقابلِ تردید فتح ہے۔ اس قسم کی ہر تنسیخ کے وقت وہ یہ سوچتا ہے کہ ہمارے اصولِ آزمائش کو معراج نصیب ہوئی ہے اور اس میں پہلے سے کہیں زیادہ صحیح تجربہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور چونکہ اس معراج کا سہرا انسان کے سر ہوتا ہے لہٰذا اس کے ساتھ اس کا مرتبہ بھی بلند ہو جاتا ہے۔

کسی زمانے میں انسان اپنے نامحسوس ماحول سے خائف تھا جسے خود اسی کے تصور نے خبیث روحوں سے بسا رکھا تھا، جن پر قابو رکھنا اس کے لئے اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ اسی طرح اس پر کائنات کا خوف بھی طاری رہتا تھا جو یا تو قوائے خبیثہ سے ہم کنار یا کم سے کم ان کے زیرِ اثر تھی اور ایک جارحانہ اور بے عنان انداز سے عمل پیرا۔ آج تو یہ ایک عجوبہ بات ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اگلے زمانے میں سمجھ دار لوگ بھی انسان کی بے مائگی اور زندگی کی مشکلات کے مقابلے میں اس کی شکستہ پائی پر بغلیں بجاتے تھے۔ مگر اس قسم کے خیالات اب ان لوگوں کے دماغوں سے بھی رخصت ہو گئے ہیں جو جدید رجحانات کے قائل نہیں ہیں۔

اب اگر کوئی ڈرتا ہے تو اعتراض اور اختلافات سے سرطان کی مثال لیجئے۔ اس سے اب بھی ہمارا پنڈ نہیں چھوٹتا۔ اس کو نہ ہم دفع ہی کر سکتے ہیں نہ اس پر مکمل طور پر

قابو ہی پا سکتے ہیں۔ غرض ہم اس سے خائف تو ضرور ہیں مگر ہمارا خوف پہلے جیسا خوف نہیں ہے۔ اس باب میں ہمارا طرزِ عمل بالکل مختلف ہے۔ مثلاً اول تو ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ سرطان اپنے عمل میں کسی قانون یا سبب سے مستثنیٰ ہے اگرچہ اس کے عمل کا قانون ہمارے علم میں نہیں ہے، دوسرے ہمارے پاس اس کے مقابلے کے لئے بھروسے کے ذرائع موجود ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ آج نہیں تو کل ضرور ہم اس کے اوپر قابو پا لیں گے۔

اس جدید طرزِ عمل کی ایک نہایت نمایاں خصوصیت یہ رجحان ہے کہ ہمیں اپنے سماج کی تنقید و تنقیح کرنی چاہیئے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس تنقید کی روشنی میں جو نتائج رونما ہوں ان کے مطابق سماج میں تبدیلی بھی کر لینی چاہیئے۔ اس باب میں اب معمولی سے معمولی دماغ کا آدمی بھی یہ سمجھنے لگا ہے کہ سماج انسان کا بنایا ہوا ہے اور اس کی خاطر بنایا گیا ہے لہٰذا اگر وہ انسانی زندگی سے ہم آہنگ نہ ہو تو اُسے بدل دینا چاہیئے۔ احتساب کی اس گرفت سے کوئی چیز مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس صورتِ حال کی شدت دیکھنی ہو تو آج کل کے بعض شعراء، افسانہ نویسوں اور تمثیل نگاروں کے حلقے میں ملاحظہ فرمایئے۔ جنھیں معلوم ہوتا ہے یقین ہو گیا ہے کہ جمہور کو اپنے مذہب، خاندان، اخلاق، صنعتی نظام، قانونِ ملکیت، جنگ اور خود اپنے نظامِ ریاست کو چار و ناچار بدلنا ہے کہ اس کے سوا چارہ نہیں اس کڑی آزمائش سے کسی چیز کو صرف اس لئے کہ کچھ لوگ اسے مقدس و متبرک سمجھتے ہیں، چھٹکارا نہیں ہے۔ اب ہر چیز پر جرح ہوتی ہے۔ ہم بہ حیثیت افراد کے ان تنقیدوں کے متعلق جو چاہیں سمجھ لیں، اور زیرِ نظر ترقیوں کی اہمیت سے

جتنا چاہیں اختلاف کریں، مگر چیزوں کو تنقید و تبصرے کی کسوٹی پر کسنے کا رجحان اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اور ہم اس کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔

تنقید و تبصرہ کا رجحان یونانِ قدیم کے سوفسطائیوں میں بھی تھا اور اس موقعے پر یہ سوال بجا طور پر اٹھتا ہے کہ آیا موجودہ فکر کو تنقید و تبصرے کے باب میں ان سوفسطائیوں پر فوقیت حاصل ہے؟ یونانیوں کو فکر کے میدان میں حیرت انگیز سہولتیں حاصل تھیں۔ اور ان کے مقابلے میں ہماری تنقید شاید زیادہ بے لاگ نہیں ہوتی۔ مگر موجودہ طرزِ عمل پہلے سے بالکل مختلف ہے۔ اب آزمودہ خیال کی کثرت نے تنقید کے ہر شعبے میں بلا استثنار ناگزیری اور لزوم کا ایک شعور پیدا کر دیا ہے۔ اب لاابالی سے لاابالی انسان بھی سائنس کی فتوحات کو دیکھتا ہے اور مبہوت ہو جاتا ہے، "ترقی" نے دماغوں کو مسحور و مفتون کر لیا ہے۔ فکر کا یہ پہلو بہر حال آنا تھا اور آیا۔ وہ کن منزلوں سے گذر کر آیا، اس کی تصدیق کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنا یہ میلان ہماری تصدیق کا مستحق ہے کہ سماجی اداروں کو زندگی کے مسائل کی روشنی میں پرکھا جائے۔ اگرچہ اس جانچ کے لئے معیار کی تعیین آسان کام نہیں ہے مگر کم سے کم اس سے پروگرام اور طریقِ کار کے رُخ کی تعیین ضرور ہو جاتی ہے۔ اس تعیین کی قدر و قیمت کا اندازہ کچھ انھی لوگوں کو ہوا ہوگا جنھیں مسئلہ طلاق میں کسی پادری سے بحث و استدلال کا موقع ملا ہوگا۔ اس قسم کے مخالف کے ساتھ طریقِ تعیینِ عمل کا امکان موہوم ہے۔ محض نتائج و عواقب کسی مسئلے کو طے کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتے۔ حصولِ نتائج اور ان کی قدروں کا اندازہ لگانے کے لئے معیارِ تنقید کی تطبیق خواہ کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو، اس سے کم سے کم اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ مسئلہ زیرِ بحث میں

سوچ بچار اور تجربے اور جانچ کی گنجائش موجود ہے۔

بہ ایں صورت اب یہ بات مسلّم معلوم ہوتی ہے کہ کسی خیال کو تسلیم کرنے سے پہلے اسے پرکھ لینے کا اصول آہستہ آہستہ مگر پختگی کے ساتھ ہمارے زمانے کی عام ذہنی فضا پر چھاتا جا رہا ہے۔ اس اصول کے پیکر میں انسان ایک نئے عقیدے پر گامزن ہے جوں جوں زمانہ بڑھتا جاتا ہے، محسوس اور نامحسوس دونوں عالموں کے لئے ایک نئے جامے کی تلاش اور اشتیاق میں اس کی شدت بڑھتی جاتی ہے۔ اس راہ میں اس سے انکار نہیں کہ خطرے بھی بہت ہیں۔ ان خطرات میں بعض کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ ایک کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی رواج یافتہ سائنس کی قوت وعظمت سے متاثر و مرعوب ہو جانے کا عام رجحان اور اس مرعوبیت کے زیر اثر ہر اس بات کو آنکھ بند کر کے مان لینے کی عادت، جو سائنس کا بھیس بدل کر سامنے آئے۔ دوسری طرف نتائج کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا رجحان نفع بخش بھی بہت ہے۔ اور عملی انسان تو چھوٹے اور نجی معاملوں میں ہمیشہ اس اصول کی ایک حد تک پابندی کرتا رہا ہے۔ بڑے بڑے مسائل پر بھی کچھ اسی انداز سے سوچا گیا تھا مثلاً اداے "انسان کے لئے" بنائے گئے ہیں اور درختوں کی طرح ہمیں ان کے متعلق ان کے "پھلوں" کو دیکھ کر فیصلہ کرنا چاہیئے مگر عام طور پر روایات اور دستور ہی کا بول بالا رہا ہے۔ اور ماضی کی تحریم و تقدیس نے جو لوگوں کے دلوں میں قائم ہو گئی تھی بہت زمانے کے بعد نتائج کی روشنی میں سوچنے کی اجازت بخشی ہے۔ اب بھی ایسے لوگ بہت کم ہیں —— معدودے چند —— جو بات کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر رجحان بہر حال روز بروز بڑھ رہا ہے۔ چیزوں

کو نتائج کی روشنی میں پرکھنے کی قدر آہستہ آہستہ مگر پختگی کے ساتھ اپنا نقش بٹھاتی جارہی ہے۔ اس طرح آدمی کی ذہنی ساخت کی مختلف پہلوؤں سے گویا نئی تشکیل ہو رہی ہے۔

صنعتیت اور ہماری بدلتی ہوئی دنیا

صنعتی نظام کے ارتقاء سے سماج میں اتنے ان گنت اور دوررس نتائج رونما ہوئے ہیں اور یہ کہانی اتنی خوبی سے باربار دُہرائی جاچکی ہے کہ اس باب میں اب مزید کچھ کہتے ہوئے تکلف ہوتا ہے۔ اس مسئلے کے جن پہلوؤں پر یہاں بحث مقصود ہے، ان کا انتخاب گو بالکل من مانا ہے مگر اٹکل پچو نہیں ہے۔ انتخاب ان چند خصوصیتوں کا کیا گیا ہے جن کا ادارے پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔

ہمارے صنعتی نظام کے ارتقاء کا ایک سب سے نمایاں اثر یہ ہے سماج میں زیادہ سے زیادہ (INTEGRITY) سالمیت آتی جارہی ہے اور اسی کے پہلو بہ پہلو انسان روز بروز ایک دوسرے کا محتاج اور پابند ہوتا جارہا ہے۔ طاقت سے چلنے والی مشینوں کے دَور سے پہلے ہر گاؤں اور ہر قریہ بہت بڑی حد تک خودکفیل تھا۔ ضرورت کی ہر چیز، کھانا، کپڑا، مکان۔ اگرچہ بالکل سادی اور غیرمزین ہوتی تھی، ——— وقت کے دفت اور پاس کے پاس

دستیاب ہو جاتی تھی۔ یہاں تک کہ امیر امراء بھی جو شاید شہروں میں رہتے تھے، ان کی ضروریات بھی اسی دستور کی پابند تھیں سوائے چند تعیشات کے جو اس دستور سے مستثنیٰ تھیں۔ زندگی کے اس نظام میں صنعت وحرفت کا خاص مرکز خاندان یا کنبہ تھا جس میں اگر کوئی کمی رہ جاتی تھی تو وہ شہروں کے محنت کش مزدوروں کی جماعتوں سے پوری ہو جاتی تھی۔ مگر طاقت سے چلنے والی مشینوں نے اس نظام کی کایا پلٹ دی۔ مثال کے طور پر کتائی اور بنائی کی صنعت میں جب سے طاقت سے چلنے والے چرخے اور کرگھے کا عمل دخل ہوا، خاندان نے کارخانوں کے لئے جگہ خالی کر دی۔ ادھر اوٹائی کی صنعت اور ذرائع نقل وحمل کی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ روئی اور اون امریکہ اور آسٹریلیا میں پیدا کئے جاتے ہیں۔ وہاں سے جہازوں میں لاد کر ہزاروں میل کے فاصلے پر کتائی کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ کتائی کے بعد بنائی کے لئے اور اس کے بعد پھر سلائی کے لئے۔ اور ان منزلوں سے گزرنے کے بعد ہزاروں لاکھوں بستیوں میں جو ایک دوسرے سے کالے کوسوں دور ہوتی ہیں بکنے اور تقسیم ہونے کے لئے جاتے ہیں۔ غرض خام اشیاء دنیا کے دور افتادہ سے دور افتادہ مقامات سے لائی جاتی ہیں، کارخانوں میں انھیں مصنوعات کی شکل دی جاتی ہے اور پھر ان مصنوعات کو جہازوں میں بھر بھر کر کرۂ ارض کے دور و نزدیک بے شمار اقطار واکناف میں بھیجا جاتا ہے۔ اس طرح ہر حصہ دنیا کے دوسرے حصوں سے آکر جڑ جاتا ہے ایک دوسرے کی محتاجی اور پابندی اسی صورت حال کا ایک نام ہے۔ اس صورت حال نے جس پر تقسیم کار کے اصول نے اور گہرا رنگ چڑھا دیا ہے، ملکوں اور

جماعتوں کی طرح افراد کو بھی ایک دوسرے کا محتاج اور پابند بنا دیا ہے۔ ان رجحانات کی روز بروز ترقی، روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ایک دوسرے کی محتاجی اور ہیئت اجتماعی کی سالمیت سماج کے ارتقاء کے دو لازم و ملزوم پہلو ہیں۔

ارسال و ترسیل اسی سماجی سالمیت کا علمی پہلو ہے۔ اس میں جہاں تک تبلیغ خیالات کی سہولت اور عجلت کا تعلق ہے، غیر معمولی ترقی ہوئی۔ نپولین بوناپارٹ جس عجلت کے ساتھ ایک خط پیرس سے روم بھیج سکتا تھا، اتنی ہی عجلت کے ساتھ جولیس سیزر بھی اپنا فرمان روم سے پیرس بھیج سکتا تھا۔ اس لئے کہ جولیس سیزر کے زمانے سے بوناپارٹ کے عہد کی نہ سڑکیں ہی بہتر حالت میں تھیں اور نہ گھوڑے ہی زیادہ تیز رفتار تھے۔ نپولین کے عہد کے بعد سے نقل و حمل کے چار ایسے ذرائع نظر آتے ہیں جنھوں نے خطوط اور کتابوں کے ارسال و ترسیل میں غیر معمولی سہولت پیدا کر دی ہے۔ دُخانی جہاز۔ ریلیں۔ موٹر اور ہوائی جہاز۔ ان کے بعد چار اور ذرائع رونما ہوئے۔ جنھوں نے ترسیل و انتقالِ الفاظ کو مدت اور وقت سے بالکل بے نیاز کر دیا ہے۔ تار برقی۔ کیبل۔ ٹیلیفون اور لاسلکی۔ ان چیزوں نے فکر و خیال کے لئے کیا کچھ کیا، اس کا صحیح اندازہ ہمیں عہد نپولین کے اور موجودہ دور کے اخبارات کا باہم مقابلہ کرنے سے ہوگا۔ ہم لندن ٹائمز اور نیویارک ٹائمز وغیرہ کی صبح کی اشاعتوں میں روزانہ ایک دن پہلے کے تمام واقعات پڑھ لیتے ہیں جنھیں شاید ہی ریڈیو سٹوں کے ذریعے دنیا کے ہر حصے سے خواہ وہ کتنی ہی مسافت

پر کیوں نہ واقع ہوا ہو، اکٹھا کر کے آن کی آن میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ نپولین کے زمانے کا اچھے سے اچھا اخبار بھی خبر رسانی کے ذرائع میں انتہائی کوششوں کے باوجود اتنی وسعت نہیں پیدا کر سکا تھا۔ بہت سے مقامات تو انسان کی پہنچ سے بھی باہر تھے۔ پھر جو کچھ تھوڑی بہت خبریں حاصل ہوتی تھیں، انھیں چھپ کر اور شائع ہو کر پڑھنے والوں تک پہنچنے میں مہینے لگ جاتے تھے۔ یہ فرق اس وقت واضح ہو جاتا ہے جب ہمیں یہ واقعہ یاد آتا ہے کہ نیواورلیونسز کی لڑائی میں طرفین کی فوجیں صلح ہو جانے کے بعد بھی پندرہ دن تک برابر معرکہ آرا رہیں۔ ذرائع رسل ورسائل جو جماعت کے لئے بدن کے نظام عصبی کی حیثیت رکھتے ہیں، اتنے پھیل گئے ہیں اور ان کی رفتار میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ اگر اسی طرح کا اضافہ ذرائع آمد و رفت اور مبادلۂ اشیاء میں بھی ہو جائے تو دنیا کی بالکل قلب ماہیت ہو جائے۔ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ اس میں اضافے کے میلانات اب بھی بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں اور منزل کا سراب بھی نظروں سے اوجھل ہے۔

ان تحریکات کا جن پر ابھی گفتگو ہوئی، ایک نتیجہ یہ ہے کہ ایک جگہ جمع ہونے کا رجحان روز بروز زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ معاشی تحرکات سے چھوٹے چھوٹے کارخانے بڑے بڑے کارخانوں، اور بڑے بڑے کارخانے صنعتی لیتیوں (کارپوریشنوں) میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ زندگی وسیع سے وسیع تر ہوتی

جاتی ہے۔ کارخانوں کے آس پاس بستیاں بستی ہیں۔ کارخانوں پر کارخانے قائم ہوتے ہیں۔ شہر بڑے سے اور بڑا ہوجاتا ہے۔ لوگ دیہی علاقوں سے انبوہ در انبوہ شہروں میں چلے آتے ہیں۔ اس تبدیلی وطن سے شہر کی آبادی کی میزان لاکھوں سے کروڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ بڑھتی ہوئی دولت آفرینی بڑھتی ہوئی آبادی کی کفیل بھی ہوسکتی ہے۔ ہر نہج کے کاردار کی کامیابی کے ساتھ تنظیم ہوتی ہے۔ اس تمام عمل میں بڑھاوا" دینے والوں کی مدد شامل حال رہتی ہے۔ غرض ہر طرف زندگی وسیع سے وسیع تر ہورہی ہے۔

یہ وسعت مائل بہ ترقی ہے۔ فرد کی ہستی گھٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ صنعتی بستیوں (Corporations) کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسی نسبت سے ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے جو خود اپنا کاروبار چلانے کے بجائے دوسروں کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔ اس طرح فرد جو دوسروں کا محتاج تھا، اس ترقی پذیر وسعت سے اور بھی محتاج اور پابند ہوتا جاتا ہے۔ چیزوں کے اسباب وعلل کو سمجھنے کا اب نہ موقع باقی ہے نہ اس کی کچھ اہمیت ہی ہے۔ اور انسان پر روز بروز یہ حقیقت روشن ہوتی جاتی ہے کہ اس کا غور وفکر بس اسی کی ذات تک محدود ہے دوسروں کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ قوت اور جوش کی بے اطمینانی کے اس عالم میں غم وغصے کی لہر بہت آسانی سے پھیل جاتی ہے۔ اسی قسم کی صورت حال سے شہری سیاسی معاملات میں بھی دوچار ہو رہے ہیں۔ جمہور میں رائے

ہو ہندوؤں کا حلقہ جتنا وسیع ہوتا جارہا ہو، فرد واحد کی اہمیت میں اسی نسبت سے کمی ہوتی جارہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں آخر اس سے فائدہ کیا؟ اور پھر میری حقیقت ہی کیا ہو"

اس رجحان کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہو کہ ہمارے یہاں انتخاب کے موقع پر پہلے رائے دہندوں کی کل تعداد کا ۸۰ فیصدی حصہ رائے دیتا تھا مگر اب یہ اوسط گھٹتے گھٹتے ۵۰ فیصدی رہ گیا ہو۔ اسی طرح ہوتے ہوتے وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے جسے عوام الناس کی تقدیر پرستی" (FATALISM OF THE MULTITUDE) کہتے ہیں۔ یعنی یہ عقیدہ کہ عوام الناس کے لیے پھر کسی کو کسی چیز کا تعین دلانے میں فکر و خیال کا کام بہت کم ہوتا ہے شخصی ذمے داری مائل بہ زوال، ونی ہے اور خود پرستانہ انفرادیت نہایت آسانی کے ساتھ اسکی جگہ لے لیتی ہے۔ گویا ایک زبردست لعنت دنیا کی اس وسعت پر مسلط ہوتی جارہی ہے۔

مذکورہ بالا سالمیت اقوام پر بھی نہایت دور رس اثر کر رہی ہے۔ آپ کا اپنا ملک اپنے ابتدائی عہد میں محلِ وقوع کی علیحدگی، قابل تبادلہ مصنوعات کی عدم موجودگی، ذرائع آمدورفت کی مشکلات کے سبب سے نو آبادیوں میں سب سے الگ تھلگ تھا۔ انقلاب آیا اور کامیاب بھی ہوا مگر اس وقت بھی مختلف ریاستیں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جلتی رہتی تھیں۔ خوش قسمتی سے دستور اساسی نے بنیادی طور پر بین الملکی تجارت کو مرکز کی نگرانی میں دے دیا اور اس طرح ملکی

سالمیت کی بیڑیاں کٹ گئیں اور اسے پنپنے اور بڑھنے کا موقع ملا۔ آبادی اور مبادلے اور انھی کے دوش بدوش سفر اور ذرائع رسل و رسائل کی ترقی کی بدولت ——— اگرچہ ریاستوں میں ناچاقیاں رہیں اور لڑائی تک کی نوبت پہنچ گئی ——— ملکی اتحاد اپنے وقت پر مکمل ہو گیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ریاست کو جس کی کبھی بہت اہمیت تھی، جمہور کے فکر و تدبیر میں اب بہت کم دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود سالمیت اپنا کام کر گئی۔ مگر کیا یہیں پر بس ہے؟ کیا صرف ایک قوم ہی سالمیت کا مرکز عمل ہے؟ بالکل نہیں ممکن ہے اور چیزوں کے معاملے میں حقیقت اور ہی کچھ ہو، مگر تجارت اور ذرائع نقل و حمل کی ترقی قومی حدود کی پابند نہیں ہے۔ جہاں کہیں بھی انسان بستا ہے، سالمیت کا عمل کارفرما ہے۔ کیا یہ عمل حقیقت دائمی کی صورت اختیار کرے گا؟ یہ سلسلہ جاری رہے گا؟ بظاہر اس کے ختم ہونے کی کوئی وجہ تو نہیں معلوم ہوتی۔ فکر کا انسانی زندگی (اختراعات و ایجادات) میں استعمال، اور قدرتی ذرائع کی گوناگونی ان دونوں چیزوں کی ایک ساتھ موجودگی ایک سدا بہار اور رنگ برنگی صنعت کا پتہ دیتی ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ مبادلے میں طرح طرح کی شکلیں پیدا ہوں گی اور اسی کے ساتھ ساتھ رسل و رسائل میں بھی ترقی ہوگی۔ لہذا لازمی طور پر سماج کی سالمیت قائم ہوگی اور ایک ترقی پذیر سالمیت۔ ہو سکتا ہے کہ جنگی کی چوکسیاں اور تجارتی بغض و حسد کسی حد تک اس کی ترقی کی رفتار کو

روک دیں مگر اسے ختم نہیں کر سکتے۔ جب تک تہذیب صحیح و سلامت ہے، سالمیت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس کا اثر بین الاقوامی تعلقات پر جو کچھ پڑے گا، وہ بھی ظاہر ہے۔ قوموں کی ایک دوسرے سے علیحدگی کم سے کم ہوگی، ان کا آپس کا تعلق زیادہ سے زیادہ ہوگا۔ اس صورت حالات سے مسائل کھڑے ہونگے ان کا طے ہونا بھی ضروری ہے۔ جلد یا بدیر ان مشترکہ مسائل کے تصفیے کا ایک نہ ایک مشترکہ حل نکل آئے گا۔ ایک حل جنگ ہے، جنگل کا قانون! اور جنگ متحد و مسلم دنیا کے حق میں سماجی خودکشی ہے۔ صنعتی نظام کا نتیجہ سماجی سالمیت ہے اور یہ سالمیت نہایت دور رس اثرات کا پیش خیمہ ہے۔

جمہوری رجحان

موجودہ دنیا کے رجحانات میں سے جن کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں، ایک رجحان انسانوں کا وہ احترام ہے جسے ہم جمہوریت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس باب میں ہمیں یہی نہیں دیکھنا ہے کہ طرزِ حکومت پر اس کا کیا اثر ہے اس لئے کہ اس کا حلقۂ اثر اس سے زیادہ وسیع ہے: "یہ کل" بہت سے اجزا سے مل کر بنا ہے۔ سب سے زیادہ مستحکم الاصل جزو شاید یہ ہے کہ ہر فرد ایک شخص ہے اور اس کے ساتھ اسی حیثیت سے سلوک ہونا چاہیئے۔ مزید براں دنیا، اس کے ادارے اور اس کے ذرائع انسان کے ہیں۔ اور

اسی کے بہبود کے لئے باقی ہیں۔ پھر یہ کہ چونکہ انسان انسان اسی وقت تک ہے جب تک وہ جماعت سے وابستہ ہی لہذا ہر ایک کی ترقی و تعمیر اس انداز پر ہونی چاہیئے کہ اس سے پوری جماعت کی ترقی و تعمیر مراد ہو نہ یہ کہ جماعت میں اگر کوئی ترقی پسند فرد ہی تو اس کی ترقی پسندی دوسروں کی فنا سے عبارت ہو۔

مذکورہ بالا تینوں رجحانات میں سے اس جمہوری رجحان کا آزمودہ خیال سے براہِ راست تعلق نسبتاً بہت کم ہی۔ اگرچہ کچھ لوگ صنعتی نظام اور جمہوریت کی منظم اور متحدہ مخالفت کی تعلیم دیتے ہیں، مگر یہ طرزِ عمل صحیح نظرئے پر مبنی نہیں ہے۔ جمہوریت ہی تو اصل زندگی ہی، اخلاقی زندگی کی بیخ و بنیاد۔ یہ بالکل صحیح ہی کہ موجودہ صنعتی نظام نے بہت سے پیچیدہ اور مشکل مسائل کھڑے کر دئے ہیں۔ مگر اس قسم کے مسائل کچھ اسی سے مخصوص نہیں ہیں، ہماری تہذیب اور ہماری پوری زندگی میں مسائل آتے ہیں اور آتے رہیں گے۔ اس باب میں بظاہر بڑی شد و مد سے کہا گیا ہی کہ انسان اگر صنعت پر قابو حاصل نہیں کرتا تو وہ دن دور نہیں جب وہ خود انسان کے لئے عذاب جان بن جائے گی۔ گویا موجودہ صنعت کے چند ایسے پہلو ہیں جو اگر بے عنان اور آزاد چھوڑ دئے گئے تو جمہوریت کے مطالبات کو ٹھکرا دیں گے اور ان کے مقابلے میں خود زندگی کو مغلوب ہونا پڑے گا۔

ہمارے تصور کے مطابق جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے ذکر کیا گیا ہی، جمہوریت ایک کوشش ہی، سماج کو اخلاق کی بنیادوں پر قائم کرنے کی۔ وہ اخلاق جس کا منہوم یہ ہی کہ افراد کی ترقی و تعبیر زیادہ سے زیادہ جہاں تک ممکن ہو من حیث الجماعت ہونی چاہیئے۔ دنیا میں آج کل آمریتیں موجود ہیں، سرمایہ دارانہ بھی اور اشتراکی بھی، ہر طرف اجارہ دارانہ خود غرضی اور مطلب پرستی کا چرچا ہی، مگر ان تمام رکاوٹوں کے باوجود بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہی کہ انسان کو اس وقت تک اطمینان اور چین نصیب نہ ہوگا جب تک اس کا نظامِ جماعت اصل جمہوریت کے منافی رہی گا، جماعت کی کوئی ترتیب جب تک وہ "چار دن گھونٹ" برابر کے اصول پر مبنی نہیں ہوگی ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ صرف جمہوریت وہ پروگرام پیش کرتی ہے جسے عوام کی تائید ہمیشہ حاصل رہی گی اور بس۔

ہمارے غور و فکر کا غرض خلاصہ یہ ہی کہ دنیا میں اب تک جو کچھ ترقیاں ہوئی ہیں، ان کا راز آزمودہ خیال اور صرف آزمودہ خیال میں مضمر ہی۔ اور دنیا کو موجودہ رنگ دینے میں یہی محرک کار فرما رہا ہی۔ ہم نے جدید انسان کے طرزِ عمل کو دیکھا، صنعتی نظام کی روشنی میں جدید زندگی کے مسائل پر بحث کی، جمہوریت کو پرکھا جو اخلاق جدید کا ایک بنیادی مطالبہ بن گئی ہی۔ غرض زندگی کے جس پہلو کا مطالعہ کیا اِسی محرک کا عمل دخل نظر آیا۔ اب ہماری بحث دو اور نہایت اہم نتائج پر شروع ہوتی ہی جو ان تمام مباحث کی روح ہیں۔ دو اور رجحانات

جو بالخصوص اس زمانے میں نہایت قوی ہیں اور جنھوں نے تعلیم پر بہت بڑی ذمہ داریاں عاید کردی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے استنادیت کا خاتمہ اور دوسرے ہمارے تصورِ حیات میں تبدیلی کی اہمیت۔

استنادیت کا خاتمہ

استنادیت اور سند کے مفہوم کو ایک دوسرے سے الجھانا نہیں چاہئے دونوں میں فرق ہے جو شاید خارجی سند اور داخلی سند کے تفاوت سے واضح ہو جائے۔ صحیح سند وہ معیار یا پروگرام ہے جس پر عقلِ سلیم حالات کا غیر متعصبانہ طور پر جائزہ لینے کے بعد مہرِ تصدیق ثبت کردے۔ اس قسم کی سند خود عمل ارتقا کی جبلت میں داخل ہے کیونکہ یہ سند انسان خود قائم کرتا ہے لہٰذا اس کی حیثیت داخلی ہو جاتی ہے۔ اور وہ اُسے اپنا سمجھ کر بہ رضا و رغبت تسلیم کرتا ہے۔ اس کے مقابل میں استنادیت ہے جو نام ہے روائتی اسناد کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا، کسی سند پر بلا حیل و حجت ایمان لانے کا جو اپنے آپ کو منوانا چاہتی ہے مگر اپنے دعوؤں کے علاوہ اس کا کوئی اور سبب نہیں بتاتی۔ انسان کے لئے اس قسم کی سند اجنبی اور خارجی ہے جو اس کی اپنی قائم کی ہوئی نہیں ہوتی: خارج سے اس کے اوپر عائد کردی جاتی ہے۔ اس فرق کی وضاحت کے لئے آیئے چند تاریخی مثالیں لے لیں:-

ایک زمانہ تھا جب بادشاہ مطلق العنانہ طور پر حکومت کرتے تھے اور انھیں اس کا بقولِ خود خدا داد حق حاصل تھا۔ اس طرزِ حکومت کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ یہ عالم بالا کی چیز ہے اور انسان پر فرض کی طرح عاید کی گئی ہے۔ یہ ان کے لئے بالکل خارجی چیز تھی۔ مگر آگے چل کر اس نظریئے کی اشاعت ہوئی کہ حکومتیں محکوموں کی منظوری سے طاقت و اختیارات حاصل کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے حکومت نسبتاً زیادہ داخلی چیز ہوئی۔ قانون کی صورت میں تو یہ داخلی ہی ہوتی ہے اور کچھ نہیں، فرق صرف درجے کا ہوتا ہے یعنی قانون جس حدتک ایک معقول زندگی کے شرائط کی ترجمانی کرتا ہے اسی حدتک وہ داخلی ہے اور اسی حیثیت سے اس کی پابندی کرنے والے اسے دیکھتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ ایک مدت سے کم از کم نظریۂ حکومت میں ایک عام تبدیلی نظر آتی ہے۔ اس کی عمارت خالص خارجی سند کی بنیاد کو ترک کرکے داخلی سند کی بنیاد پر اٹھائی جارہی ہے۔ غرض اس حلقے میں استنادیت کا خاتمہ ہوچکا ہے۔

اسی طرح ذہنی معاملات میں ایک زمانہ تھا جب ارسطو کی سند مسلّم ومطلق سمجھی جاتی تھی، جب جمہور کی اکثریت کے لئے کسی معاملے میں ارسطو کا محض قول نقل کردینا مختلف فیہ مسائل کے تصفیئے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ یہ سوال کہ سند کی حیثیت سے قابلِ تسلیم ارسطو کی ذات تھی یا محض روایت، بہت کم اہمیت رکھتا ہے۔ وہ کوئی بھی تھا، دونوں حالتوں میں سند کی نوعیت خارجی تھی۔ چنانچہ

گلیلیو نے جب ایک نئی دوربین ایجاد کرکے اس کے ذریعے سورج میں دھبے معلوم کیے تو کچھ قدامت پرست بہت پریشان ہوئے۔ سورج کی حیثیت دیوتا کی تھی اور اس لیے روحانی۔ اس مقدس اور روحانی ذات میں داغوں کا وجود تسلیم کرنا سراسر کفر تھا۔ کچھ لوگوں نے تو دیکھنے سے بھی انکار کر دیا۔ کچھ لوگوں نے دیکھا اور دھبوں کو محسوس بھی کیا اور حیران رہ گئے۔ اس شور و ہنگامے کی فضا میں ایک بوڑھے نے اپنے ایک حواس باختہ عقیدت مند کو لکھا۔ "پریشان نہ ہو۔ اطمینان رکھو۔ میں نے ایک بار نہیں تین تین بار ارسطو کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے یہاں سورج میں دھبوں کے وجود کا کہیں ذکر تک نہیں ہے۔"

خارجی سند کی یہ ایک بین مثال تھی۔ اسی اثنا میں گلیلیو نے لوگوں کو دوسروں کے اقوال پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینے کی دعوت دی کہ یہی سند مدلل و معقول سند ہے۔ کہا "آؤ خود اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ میری بات نہ مانو، خود دیکھو اور خود سمجھو۔" نتیجہ کیا نکلا؟ جدید فکر اپنی بنیاد روز بروز داخلی سند پر رکھتا جاتا ہے۔ اور ہم یہاں بھی دیکھتے ہیں، کہ استنادیت آخری سانس لے رہی ہے۔

مذہب کے حلقے میں آئیے۔ یہاں بھی کسی حد تک وہی رجحان نظر آتا ہے اگرچہ اس کی تردیدیں کی جاتی ہیں اور آئے دن اس باب میں معرکے رہتے ہیں

ایک زمانہ تھا جب کلیسا کے فتوے صحیفۂ آسمانی سمجھے جاتے تھے۔ اس کے فیصلوں کو تسلیم کرنا اہلِ ایمان کے لئے برحق تھا۔ مگر ایک وہ زمانہ آیا جب خود کلیسا کے ایک کافی بڑے حصے نے اس کی سند کے خلاف بغاوت کی اور اس کی بجائے بائیبل کی سند کو سند ٹھیرایا۔ مگر سوائے اس کے کہ بائبل کی تفسیر و تعبیر کی ضرورت تسلیم کر لی گئی، اور کچھ نہ ہوا یہ بھی کوئی بنیادی تبدیلی نہ تھی، بات کیا ہوئی کہ ایک خارجی سند کی جگہ دوسری خارجی سند نے لے لی۔ لیکن بہرحال، تعبیر کی ضرورت کا احساس داخلی سند کی طرف ایک قدم ضرور تھا۔ سیبا تیر نے SEBATIER. اپنی شہرۂ آفاق تصنیف میں تین مذہبی اسناد کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں سے دو تو وہی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور تیسری ایک اور ہے جسے وہ روح کی سند" سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ تیسری سند ہمیں ان لوگوں میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے جو اپنے علم و ایمان کے بقدر دوسرے مذہب کے حامل ہیں۔......... ان لوگوں کے نزدیک بائبل کا ہر لفظ بلا استثنار خدا کا قول ہے اور ہر دیندار کا فرض ہے کہ اس کے ہر حرف اور ہر لفظ پر بلا استثنا ایمان لائے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے باوجود بائبل کی خاص خاص عبارتوں کو چند خاص خاص عبارتوں پر ترجیح دینے کا رجحان کٹر سے کٹر مذہبی حلقے میں بھی عام ہے۔ مثلاً نئے عہد نامے کو پرانے عہد نامے پر ترجیح حاصل ہے ایک مناجات دوسرے سے افضل ہے، خاص طور پر پہاڑی کا وعظ کہ اس

اکثر و بیشتر پڑھا جاتا ہے اور اس پر مراقبہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یوحنا کی انجیل کے چند ابواب ہیں جو خاص طور پر مقبول ہیں وعلی ہذالقیاس۔ غرض اب وہ غیر شعوری طور پر بائبل کے ان الفاظ پر نسبتاً زیادہ زور دینے لگے ہیں جو ان کی آرزوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی مذہبی زندگی کا ذاتی پہلو داخلی سند ——— بقول سیباتیر روح کی سند ——— پر عمل پیرا ہے۔

اس سلسلے میں یہاں کسی قسم کی بحث ہمارا مقصود نہیں ہے مگر اتنا بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی معاملات میں جمہور کی ایک بڑی تعداد داخلی سند کو بحیثیت آخری اور قطعی سند کے اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ان کے نزدیک کم سے کم مذہب نے تاریخی ارتقار کی منزلیں طے کی ہیں۔ پہلے مذہب میں کلیسا کی خارجی سند قطعی تھی۔ اس کے بعد خارجی سند اور داخلی سند کے مرکب کی صورت میں ایک دوسری سند رونما ہوئی یعنی بائبل کی من مانی تعبیر و تفسیر اور اب اس نے اس منزل میں قدم رکھا ہے جب مذہبی امور میں خالص داخلی سند کی کارفرمائی ہے جس کی رو سے ہر وہ بات مذہبی سند رکھتی ہے اور مذہبا تسلیم کی جاتی ہے جو انسان کی مذہبی ضروریات کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہو۔ پچھلے ایک ہزار سال کی تاریخی تیز رفتاری کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب میں بھی تبدیلی کا رُخ مطلق العنان استنادیت کو چھوڑ کر کسی حد تک داخلی سند کی طرف ہو گیا ہے۔

استنادیت کی طرف سے روگردانی کی ہمارے لیے سب سے اہم مثال

وہ ہیں جو خود ہمارے ہی زمانے میں اور ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ میرا اشارہ اخلاقیات کی طرف ہے۔ اس ملک کے والدین عموماً اپنے بچوں کو نیک و بد کی تعلیم دیتے وقت آج تک اپنی تعلیمات کی بنیاد سند پر رکھتے رہے ہیں۔ کسی نے یوں کہا:- "فلاں فلاں باتیں بُری ہیں اس لئے کہ انجیل مقدس نے ان کو بُرا کہا ہے یا جس کلیسا سے ہمارا تعلق ہے وہ انھیں برا کہتا ہے"۔ کسی نے ذرا زیادہ آزاد خیالی کا ثبوت دیا تو یہ کہہ دیا:- "دیکھو ایسا نہیں کرتے"۔ کہنے کا انداز خواہ کچھ ہی رہا، بہر نوع نیک و بد کی تعلیم کے لئے سند کتاب ہوتی تھی یا کلیسا یا رسم و رواج۔ بڑوں نے اسی نہج پر تعلیم دی اور بچوں نے اسی رنگ میں اسے انگیز کیا۔ یہ صحیح ہے کہ بچوں نے ہمیشہ حق کی پابندی کی نہ ہمیشہ باطل سے پہلو تہی کیا، لیکن اگر انھوں نے حق کی اطاعت نہیں بھی کی تو بھی جب کبھی وہ کسی بات پر پکڑے گئے تو بہ حیثیت مجموعی اعتراف کیا ہے کہ واقعی وہ غلطی پر تھے۔ معیار انھیں بہرحال تسلیم تھا۔ اگرچہ وہ کرتے وہی تھے جو ان کے جی میں آتا تھا۔

لیکن ہر چیز میں تبدیلی نظر آتی ہے۔ اب آداب و اخلاق قدیم تصورات کی رہنمائی کے پابند نہیں رہے۔ اب افہام و تفہیم کے وہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جنھیں ایک زمانے میں لوگ سننے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اب ہر بات کی غرض و غایت کے متعلق سوالات اور اس کے جواز میں ثبوت طلب کئے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک لڑکی کی زبان سے

جو اپنی سہیلیوں سے سرگوشیاں کر رہی تھی یہ الفاظ سنے گئے ــــــ اچھی خاصی حسین لڑکیوں کا گروہ تھا، "اجی میں تو جاتی ہوں۔ اگر میر بھائی ایسی جگہوں پر آزادی سے جا سکتا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ میں بھی نہ جاؤں۔ لو میں یہ چلی۔" اس لڑکی کی ماں کے شباب کے زمانے میں اس سے اتنا کہہ دینا کافی ہوتا۔ "اچھی لڑکیاں ایسی جگہوں پر نہیں جایا کرتیں۔ ایسا نہیں کیا کرتے۔" بظاہر اس لڑکی سے بھی یہی باتیں کہی گئیں ہوں گی مگر اس نے ان کی طرف سے اپنے کان بہرے کر لئے تھے۔ حق انتخاب، لٹ دار بال اور اونچے سائے ایک نئی قسم کی آزادی کی علامتیں ہیں، وہ آزادی جو ہر بات پر "کیوں" کا نعرہ لگاتی ہے اور اسے تسلیم کرنے سے پہلے بات کہنے والے سے اس کیوں کا جواب چاہتی ہے۔

یہ تبدیلی لائی ہوئی کس کی ہے؟ عورتوں اور لڑکیوں کے معاملے میں اس سوال کے ایک چھوڑ کئی کئی جواب ہو سکتے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم ــــــ حق انتخاب کی تحریک، حیاتیات کا علم، کھیل کود، موسم گرما کے کیمپ، سینما اور بائسکوپ، جدید افسانہ، تجزیۂ نفسی، جنگ، سگریٹ، موٹر، خانگی زندگی کا زوال، ملازمت میں عورتوں کا حصہ، جمہوریت کی وسعت، مذہب کی مطلق العنانی کا خاتمہ۔ اس میں شک نہیں کہ اس تبدیلی میں مذکورہ بالا سب ہی عناصر کو دخل ہے۔ مگر ان سب کے پیچھے وہی نیا ذہنی طرزِ عمل کارفرما ہے جس کا

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ خارجی سند کو تسلیم کرنے کا قدیم رجحان نہ صرف ختم ہو گیا ہے بلکہ اس پر اب اعتراضات ہوتے ہیں یہ بات کہ بائبل کی قدیم مجرد سند پر سوال جواب کرنے کا دستور ایک حد تک ارتقار اور شدید تنقید کا نتیجہ ہے، امر واقعہ ہے پڑھے لکھے لوگوں میں اس مُراتم سند کی مداخلت میں شاذ ونادر ہی کوئی آواز اٹھتی ہے اور پڑھے لکھے پادریوں کے یہاں تو اتنی بھی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ آزمائشِ فکر کے اصول نے اپنا کام پورا کر لیا ہے اور پورا کیا ہے دو راہوں سے، بائبل کی قدیم خارجی سند کی تردید وتنسیخ کر کے اور ثانیاً سوال وجواب کی عادت کی ترویج وتبلیغ کر کے۔ یہ سمجھ لینا ضروری نہیں ہے کہ لوگوں کو جدید طرزِ عمل کا شعور ہے نہ یہ لازم ہے کہ جن لوگوں نے کوئی نیا طرزِ عمل اختیار کیا ہے، اس میں ان کے ارادے اور شعور کو دخل ہے۔ اس کی عمومیت اور وسعت دیکھی جاتی ہے اور اب زندگی اور مذہب کے تغیرات کا احساس وشعور موجودہ نسل کے والدین کو اتنا نہیں ہے جتنا ان کے اجداد کو تھا اور اب اس تحریک کے موروثی اثرات اسی طرح موجودہ نسل کے نوجوانوں میں نفوذ کر گئے ہیں۔

تو پھر نظریہ کیا ہو؟ اس سوال کا کوئی فوری جواب ممکن نہیں۔ بات یہ ہے کہ مطلق العنانہ اخلاق کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ بالکل سادہ اور ہموار تھا اس میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا مگر یہ چیز اس جبلی اصولِ اخلاق میں نہیں ہے جب تک روایت سب کے لئے یکساں طور پر مسلّم تھی، نوجوانوں کو بُرائی سے

متنبہ کرنا آسان تھا اگرچہ اس روایت کے پیچھے کوئی معقول علت ڈھونڈھتے ہیں تو عقل چکرا سی جاتی ہے۔ ہم بوڑھے لوگ عادات واطوار کی بنیاد روایت سے زیادہ کسی اور معقول بات پر رکھنے کے عادی نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بہت جلد گھبرا جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے نوجوان اپنے اعمال وافعال کے بارے میں اپنے والدین کی بہ نسبت زیادہ مطمئن ہیں۔ یہ چیز اگر اندیشہ ناک نہ ہوتی تو ہم اسے ہنس کر ٹال دیتے۔ مگر یہ تحریک اب ہمارے قبضے سے باہر ہو گئی ہے اور بعض اوقات ہم اس باب میں اپنے آپ کو ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے کوئی دور سے تماشا دیکھ رہا ہو۔ موٹروں میں لڑکوں اور لڑکیوں کا آپس میں گتھم گتھا ہونا ایک عام رجحان ہو گیا ہے۔ ایک ماں جس کی دو لڑکیاں بھی اپنے ہمجولی لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اسی قسم کی حرکت میں مبتلا تھیں اس کے متعلق ایک موقعے پر کہا کہ "جب وہ اس طرح ایک دوسرے سے گتھ جاتے ہیں تو میں شرم کے مارے اس طرف سے نظریں ہٹا لیتی ہوں" ہائی اسکول کی عمر کے لڑکے آج کل جس قسم کی تفریحیں اور کلیلیں کرتے ہیں، ان کا حال خود ایک لڑکا اپنی ماں کو سناتا ہے جس کے متعلق وہ فرماتی ہیں کہ "اس کی باتیں سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر میں اس کیفیت کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دیتی کہ کہیں میرے اوپر سے اس کا اعتماد نہ اٹھ جائے۔" یہی حال قریب قریب تمام والدین کا ہے اور اسی زمانے میں

نہیں غالباً ہر زمانے میں رہا ہے۔ تو کیا اب کچھ نہیں کیا جا سکتا؟ اور کیا کہنے سننے کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی؟

ہم نے اب تک جن اصولوں کی روشنی میں بحث کی ہے اگر انھیں صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یہ بات قرینِ صحت معلوم ہوگی کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ بوڑھوں کی صرف رسمی بے اعتمادی ہی نہیں ہے جو انھیں عموماً نئی پود سے ہو جاتی ہے بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ اخلاقیات کے معاملے میں نوجوان طبقہ جس انداز سے خارجی سند پر موجودہ دور میں جرح کرتا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی اور ایسی کوئی مثال ہوگی بھی تو بہت شاذ، لہذا ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ بظاہر یہ ہے کہ ہم اس طبقے کے ذہن کو خارجی سند سے داخلی سند کی طرف منتقل ہونے میں مدد دیں۔ اس ذیل میں ہماری بحث آگے آئے گی، سردست ایک اندیشے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔ ممکن ہے، یہ تبدیلی یک طرفہ ہو کر رہ جائے یعنی خارجی سند کی قید سے آزادی تو حاصل کر لی جائے مگر داخلی سند کو اختیار نہ کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجیے کہ خارجی سند کو ترک کرنے کے کچھ دن بعد تک کم از کم بالکل کوئی سند ہی نہیں ہوگی اور ایک عرصے تک اخلاقی طوائف الملوکی کی کیفیت رہے گی۔

ایک طرح سے اس قسم کی طوائف الملوکی مقدّر تھی، ہر پرانی چیز کو خواہ وہ ناموزوں ہی ہو، اس سے بہتر کسی دوسری چیز کی موجودگی کا یقین کیے

بغیر چھوڑ دینے کا یہی قدرتی نتیجہ ہے۔ مگر حالت مایوسی کی حد سے بھی گذر چکی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کل سب سے بڑی خرابی نوجوانوں کے طبقے سے زیادہ والدین کے حلقے میں نظر آتی ہے۔ نوجوانوں کے یہاں جہاں بہت تکلیف دہ خرابیاں اور برائیاں ہیں وہاں بہت سی مسرت بخش خوبیاں بھی ہیں۔

اکثر نوجوان موجودہ صورتِ حالات پر حسن سنجیدگی اور اصلیت کے ساتھ سوچ بچار میں مصروف ہیں۔ اس کی ان کے والدین کو کبھی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی ان میں بیجا ثقاہت اور بناوٹی شرم و حیا کی جگہ واقعات و حقائق سے دوچار ہونے کی ایک سچی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ آزادی اور بے باکی میں یوں بھی بڑا فائدہ ہے جو آگے چل کر مستحکم اور پائیدار ہو جاتا ہے۔ بعض بوکھل اخلاق کی بڑھتی ہوئی پستی اور نو خیز لڑکوں کی جرائم پیشگی کے بارے میں شکایات کی پوٹ بنے ہوئے ہیں مگر انھیں اپنے دعووں کو ثابت کرنے کے لئے معقول طور پر مقدمات کی فراہمی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ نظر کی اس حد تک اس مبینہ اخلاقی پستی کے متعلق اگر کسی کو شک ہے، تو وہ حق بجانب ہے۔ مگر اس کے برعکس جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، اگر ہم ذرا وسیع نظری سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ نوجوان طبقہ اپنی منزل کی تعیّن میں اپنے بڑوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریقے پر غور کر رہا ہے۔ استنادیت مٹ ضرور رہی ہے مگر انھیں اگر اچھی رہنمائی مل گئی تو اخلاق و معاشرت کے باب میں ان کا مستقبل زیادہ تابناک اور

روشن ہوگا۔

تبدیلی کائنات کی فطرت ہے اور روز افزوں تیز رو

جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد سے زمانہ اتنی تیزی سے بدلا ہے کہ لوگ عاجز آ گئے اور تمنا کرنے لگے کہ کاش یہ رفتار دھیمی پڑتی اور ذرا دیر دم لینے کی فرصت مل جاتی۔ مگر کیا رفتار کے دھیمے ہونے کی کوئی امید ہے؟ کیا جوں جوں جنگ افقِ ماضی میں گم ہوتی جائے گی، حالات کی رفتار بھی کم ہوتے ہوتے پہلے کی طرح اعتدال پر آ جائے گی؟ اس سوال کا کوئی قطعی اور آخری جواب دینا تو مشکل ہے مگر ہم اپنی معاشرتی تبدیلی کے حقیقی اسباب کی تحقیق کریں تو ایک موٹا جواب مل سکتا ہے۔

ہماری زندگی کے طور و طریق میں یہ تبدیلیاں کیوں پیدا ہوئیں؟ جہاں تک پچھلے ایک سوسال کا تعلق ہے، جواب صاف اور واضح ہے۔ ان کا سب سے بڑا سبب دنیا کی لاتعداد اور مختلف النوع ایجادات ہیں۔ گذشتہ صدی کے نصفِ آخر تک تار کے علاوہ تمام بڑی بڑی برقی ایجادیں ہمارے معمولات زندگی میں داخل ہو چکی تھیں۔ پٹرول سے چلنے والے انجن کی ایجاد نے ہوائی جہاز اور موٹر کا اور اضافہ کر دیا۔ غرض بڑی بڑی ایجادیں ہی اگر لی جائیں تو ان کا شمار بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ کا کوئی گذشتہ دوران چیزوں کی

مثال پیش نہیں کرسکتا۔ بڑی بڑی ایجادیں جتنی پچھلے ایک سو برس میں ہوئیں، اتنی پچھلے ایک ہزار سال میں بھی نہیں ہوئی تھیں۔ اور اس لحاظ سے اس صدی کا نصف آخر نصفِ اول سے بھی بازی لے گیا ہے۔ جدید دنیا میں ایجادات کا یہی مسلسل سیلاب ہے جس نے ہماری زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ ہمارے کردار کے انداز کو بھی بدل دیا ہے۔

تو پھر اب کیا ہونے والا ہے؟ کیا تبدیلی کی رفتار دھیمی پڑ جائے گی؟ یا اور تیز؟ یہاں بھی ہمیں اس کے سبب پر غور کرنا چاہیئے۔ اگر معاشرتی تبدیلیوں کا سبب ایجادیں ہیں تو پھر ایجادوں کا کیا سبب ہوتا ہے؟ جواب بالکل واضح ہے۔ ایجادیں آزمودہ خیال کے مجموعے سے پیدا ہوتی ہیں۔ تو ایجادات کا سلسلہ گھٹے گا یا بڑھے گا؟ یا ایک حالت پر قائم رہے گا؟ اس کا صرف ایک جواب ہے۔ جب تک تہذیب اپنی جگہ قائم ہے اور اس سے انسان کی دلچسپی باقی ہے۔ آزمودہ خیال میں دن پر دن اضافہ ہوتا رہے گا۔ آزمودہ خیال کا روز افزوں مجموعہ جتنا ہی بہتر سے بہتر طریق پر آزمودہ شکل میں ہوگا اتنے ہی زیادہ سائنس کے میدان میں انکشاف ہوں گے۔ چنانچہ آزمودہ خیال میں اس عمل سے ہندسی نسبت سے اضافہ ہوتا ہے۔ معتبر خیالات کی بڑھوتری کی وجہ سے ایجادات کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور ایجادات کی ترقی سے معاشرتی تبدیلیاں کی رفتار بڑھے گی۔ تو اگر تہذیب اپنی حالت پر قائم ہے اور انسان کی دلچ

کا رُخ تبدیل نہیں ہوتا تو معاشرتی تبدیلی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جائے گی۔ استدلال بظاہر مکمل معلوم ہوتا ہی۔

تبدیلی کا فلسفہ

سماجی تبدیلی کا اسی انداز پر اور اسی رفتار سے ابھی اور آگے بڑھنے کا میلان بجائے خود اس تاریخی دور کی سب سے بڑی اور اہم تبدیلی ہی۔ تبدیلی کی رفتار ماضی قریب تک اس قدر دھیمی تھی کہ فلسفہ و اخلاق اس کی حقیقت کو بڑی آسانی سے نظر انداز کر دیتے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہی کہ وہ زمانہ اب گزر چکا ہی۔ تبدیلی اب نہایت نمایاں اور ہمہ گیر حیثیت حاصل کر چکی ہی۔ ہمارا نوجوان طبقہ ایک نامعلوم مستقبل سے دوچار ہی۔ ہم یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ اس کے لئے ہمارے قدیم حل کافی ہیں۔ اب تو بس یہی ہی کہ ہم ایک ایسے فلسفے کی بنیاد ڈالیں جو نہ صرف تبدیلی کی حقیقت کو تسلیم کرے بلکہ اپنے یہاں تبدیلی کو بہ حیثیت ایک بنیادی عنصر کے جگہ دے۔

تبدیلی کے مسئلے کا فلسفیانہ پہلو آج سے نہیں یونانیوں کے زمانے سے مابہ النزاع چلا آتا ہی۔ ہیریکلٹس (Heraclitus) نے اس کی حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا اور اپنے نظام میں اسے نہایت اہم جگہ دی تھی۔ مگر اس کا بنیادی مفہوم کچھ اور ہی تھا۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کے ثبوت

پیش کیے گئے تھے کہ کائنات میں کسی قسم کی حرکت ممکن نہیں ہے افلاطون کا تو یہ خیال تھا کہ تبدیلی کے وجود ہی سے انکار کر دینا اچھا ہے۔ اور اس نے انکار کیا اس لیے کہ اس کے نزدیک تبدیلی کے اقرار سے خود حقیقت کا وجود خطرے میں پڑتا تھا۔ ارسطو نے جو اُن سب سے زیادہ حق آگاہ تھا۔ دیکھا کہ تبدیلی کا اقرار پہلے سے زیادہ صاف اور صریح الفاظ میں ہونا چاہیے۔ اس نے اس مسئلے کا حل حیاتیات کی بنیاد پر سوچا۔ تبدیلی دراصل ایک نمو کا نام ہے جو ایک پہلے سے مقرر کی ہوئی منزل کا پتہ دیتی ہے جیسے شاہ بلوط کا بیج بڑھتے بڑھتے شاہ بلوط کا پورا درخت بن جاتا ہے۔ اس طرح ارسطو نے تبدیلی کا اعتراف بھی کر لیا اور جمود کے تصور کو بھی علی حالہ برقرار رکھا۔ شاہ بلوط کا بیج خود متوقع شاہ بلوط ہے اور شاہ بلوط حقیقی شاہ بلوط۔ اس تصور کے مطابق تبدیلی اس عمل کا نام ہے جس سے توقع حقیقت کا جامہ پہن لیتی ہے خود شاہ بلوط اس تمام عمل میں ہمیشہ شاہ بلوط ہی رہتا ہے یعنی بیج درخت، بیج درخت بیج درخت............ اسی نظریے کے مطابق تبدیلی ایک نظام کی پابند، واجبی، محدود اور پیش بینی کے قابل ہے۔

تبدیلی کے بارے میں افلاطون کا طرزِ عمل معلوم کر لینے کے بعد جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ایک ایسی ریاست کی تعمیر و تشکیل میں منہمک تھا جو ہمیشہ ایک حال پر قائم رہنے والی تھی، تو ہمیں تعجب نہیں ہوتا۔ اسی مقصد کے پیش نظر وہ اپنی ریاست سے تبدیلی کے وجود ہی کو ختم کر دینے کی فکر میں تھا۔ حتیٰ کہ اس کی ریاست میں

بچوں کی لوریوں میں بھی تبدیلی ممنوع تھی کہ مبادا اس کی ریاست کے یہ ہونے والے شہری تبدیلی کے تصور میں یقین رکھنے لگیں اور بڑے ہوکر خود آئین ہی کو بدل ڈالیں۔ اسی طرح ارسطو کے تصور میں بھی ایک جاگیردارانہ ریاست کا نقشہ تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ اس ریاست کے قیام و دوام کے لئے ضروری ہو کہ تبدیلی کی حدود مقرر کردی جائیں۔ تبدیلی کے عمل سے مستثنیٰ تصور کرکے جس کسی نے بھی قدریں مقرر کرنی چاہی ہیں، خواہ سلسلۂ سلاطین کی شاہی ہو یا کسی اصول کی حکم فرمائی کلیسائی حکومت ہو یا جاگیردارانہ نظامِ ریاست، ہر ایک نے ارسطو یا افلاطون کے فلسفے کی طرح کے ایک فلسفے کی طرف میلان ظاہر کیا ہو جو اگر تبدیلی کی یک لخت نفی نہیں کرتا تو کم از کم اس پر پابندیاں عائد کرکے اس کے عمل کو محدود کردیتا ہو۔ اسی لئے ہمیں یہ دیکھ کر بھی تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ قرونِ وسطیٰ میں جاگیرداری نظام اور خود مختار کلیسا کو برقرار اور محفوظ رکھنے کے لئے ارسطو کے فلسفے کو اپنی سرکاری فلسفے کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا تھا۔

پھر تفسیر و تعبیر کی راہ سے اس ارسطاطالیسی فلسفے نے مغربی فکر کے تار و پود کی شکل اختیار کی۔ ہم خیالاتِ قطعیہ کے اظہار کے لئے تمام مصطلحات ارسطو ہی سے لیتے ہیں۔ اور ان ہی سے قریب قریب سب ہمیں نہایت پر اسرار طور پر ارسطو کے بنیادی تصورات کا پابند بنا دیتے ہیں۔ ہم چونکہ ان کے عمل سے بے خبر ہوتے ہیں لہذا ہمارے لئے ان کے ادراک کا مقابلہ مشکل

مصنفوں کے ایک گروہ نے ہمیں ایک اور نظریے سے آشنا کیا ہی: اور وہ یہ ہی "سماجی تاخر کا نظریہ"! ترقی میں عموماً یکسانیت نہیں ہوتی۔ دباؤ قدرتاً ایک ناہموار طریقے پر پڑتا ہی۔ اس چیز کی ہمیں ایک نہایت دلچسپ مثال وہاں ملے گی جہاں مشینی ایجادات سے زندگی گذارنے کے نئے نئے طریقے تو رائج ہو گئے ہیں مگر سماج کا اخلاق تبدیلی کے لحاظ سے بہت پیچھے ہی۔ چنانچہ موجودہ صنعیت نے امریکہ کے طورِ بود و ماند کو بہت بڑی حد تک بدل دیا ہی مگر ہمارے عام آئینی اور اخلاقی مطمح نظر قریب قریب وہی ہیں جو دیہی اور زراعتی معاشرت کے زمانے میں تھے۔ اگر مشینی ایجادات کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہی اور اسی مناسبت سے ہمارے طریقۂ بود و ماند میں تبدیلی ہوتی رہتی ہی تو لازمی طور پر ہمارے اخلاقی مطمح نظر کو بھی دوسری تبدیلیوں سے ہم گام رہنا چاہیئے ورنہ سماج کو بہت بڑے مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مفکرین کی ایک بڑی جماعت کا فیصلہ بھی یہی ہی کہ ہمارا سماج اسی مرض میں مبتلا ہی۔ اخلاق میں ہماری نظر اور ہمارا ادراک نئے حالات سے بالکل غیر ہم آہنگ ہیں۔ مثلاً محنت و سرمایہ کا مسئلہ ہی۔ ہم اس مسئلے کا کوئی معقول حل سوچنے سے بالکل معذور معلوم ہوتے ہیں۔ جب کبھی کوئی صنعتی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا ہی تو چونکہ ہمارے پاس کوئی معقول ذریعہ نہیں ہی۔ ہم اُسے سلجھانے اور حق و انصاف کی بنیاد پر اس کا کوئی تصفیہ کرنے سے

قاصر رہتے ہیں۔ اکثر اوقات فریقین ایک دوسرے کو اپنی مرضی اور منشار کا پابند بنانے کے لئے طاقت اور زبردستی سے کام لیتے ہیں۔ یہ وہی جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا قانون ہی جو اپنے اثر اور نتیجے کے لحاظ سے ایک ہلکی سی جنگ کی حیثیت رکھتا ہی۔ ملک کے قانون کی کوششوں سے اس میں کبھی کبھی اعتدال آجاتا ہی مگر وہ بھی بدقت تمام۔

یہی حال ہمارے سیاسی امور کا بھی ہی، ہم یہاں بھی مطمئن نہیں ہیں۔ اس معاملے میں آپ اپنے ملک کے ماہرین سیاست کو ملزم ٹھیراتے ہیں یا اپنے رائے دہندگان کو، اپنے مدبرین کو یا اپنے دستور اساسی کو، نتیجہ ہر صورت میں وہی ایک ہی۔ ہمارا سیاسی نظام بحالت موجودہ اپنی نئی ذمے داریوں کو پورا نہیں کرتا، نہ ہمارا آئینی نظام نئے مطالبات پر پورا اترتا ہی۔ ہمارے ملک کے موجودہ حالات کے متعلق ایک پختہ کار اور صاحب الرائے عالم کی یہ رائے ہی کہ ہم لوگ اس ملک میں بیسویں صدی کی ایک صنعتی قوم کا کام اٹھارہویں صدی کی زراعت پیشہ جماعت کے آئینی ساز و سامان کے ذریعے چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

سماجی تاخر کی بے شمار مثالوں میں سے چند سے پتہ چلتا ہی کہ تبدیلی کی تیز رفتاری نے جو دنیا کی مادی ترقیوں کا ایک لازمی نتیجہ ہی انسان کی موجودہ سماجی زندگی پر کہاں تک اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان مثالوں میں ہم دیکھتے

ہیں کہ ذہن واخلاق دونوں ہمارے کوہ پیکر مسائل سے عہدہ برا ہونے میں ناکام رہی ہیں۔ یہ خطرناک صورتِ حالات اس وقت تک بڑھتی ہی جائے گی جب تک کوئی انقلاب اثر واقعہ ہمیں اپنے تمدن کے ذہنی اور اخلاقی پہلو کو دنیا کی ترقی و تبدیلی کے دوش بدوش لانے کے لئے مجبور نہ کردے۔

تو پھر کیا کیا جائے؟ ایک اور مثال لیجئے۔ اس پر غور کرنے سے ہمیں اپنے طریق کار کے تعین میں مدد ملے گی۔ سوت کاتنے کا تکوا جب تک گھومتا رہتا ہی، اس وقت تک وہ نہ صرف سیدھا کھڑا رہتا ہی بلکہ اگر اُسے اس حالت میں گرانے کی کوشش کی جائے تو وہ اسٹے مقابلہ کرنے لگتا ہی۔ مگر جب اس کی حرکت بند ہوجاتی ہی تو خود بخود گر پڑتا ہی، گویا استواری مسلسل حرکت سے پیدا ہوتی ہی۔ بائسکل کو دیکھئے اس میں ہمارے حالات کا نسبتاً زیادہ صحیح نقشہ نظر آئے گا۔ بائسکل کو سیدھا رکھنے کے لئے ضرورت ہوتی ہی کہ ہم اسے چلاتے رہیں۔ کیا ہمارے سماجی امور کی استواری کے لئے اسی قسم کا ایک "متحرک توازن" تلاش نہیں کیا جا سکتا؟ ان تشبیہات کو بھی الگ رکھئے، ہم اپنے موجودہ سماجی ماحول میں تبدیلی کی تین مختلف النوع منزلیں محسوس کرتے ہیں۔ ایک تو وہ تبدیلیاں ہیں جنھوں نے ہماری مادّی ضروریات کو متاثر کیا ہی بہتر روشنی، بہتر ذرائع نقل وحمل، بہتر صحت و صفائی۔ ان تبدیلیوں کے اثر سے دوسری تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ــــــ

مثلاً جدید شہر جس کی تمام کی تمام آبادی ایک بڑے مکان کے چھوٹے چھوٹے کمروں میں رہتی ہی۔ گویا ایسے حالات جنھوں نے خانگی زندگی پر نہایت بُرا اثر کیا ہی اور وہ تقریباً ختم ہو کر رہ گئی ہی۔ تیسری تبدیلی خانگی زندگی کو نئے حالات کے مطابق ڈھال کر ایک معقول اور اطمینان بخش صورت میں تبدیل کرنا ہی۔ مگر ابھی یہ تبدیلی شعر در بطنِ شاعر ہی کی حد تک ہی۔

جب ہم تبدیلی کی ان تین منزلوں پر غور کرتے ہیں تو یہ بات بھی سامنے آتی ہی کہ ہمارے ملک میں اب تک لوگ یہ سمجھ گئے ہیں کہ پہلی دو منزلوں میں سے کسی ایک کے راستے میں بھی رکاوٹ ڈالنا نہ تو مناسب ہی ہی اور نہ شاید ممکن ہی، ایجادات اور ان کے استعمال کو بہ حیثیت مجموعی انگیز کر لیا گیا ہی اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہی۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے لوگ ان کی رفتار کو روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر ان کا اثر و رسوخ بہت محدود ہی اور اکثر اوقات ان کی مخالفانہ کوششوں کا خاتمہ موت پر ہوتا ہی۔ مگر تیسری تبدیلی کے معاملے میں یہ بات نہیں ہی۔ جب کبھی سماج یا اخلاق کا دقیانوسی نظریہ رو بہ تغیر ہوتا نظر آتا ہی، تو خواہ وہ تغیر ناقص اور ادھورا ہی کیوں نہ ہو، اس کے خلاف نہایت سخت قدم اٹھایا جاتا ہی۔ اس کی طرف سے ایک نہایت بے معنی قسم کی خاموشی بھی قریب قریب وہی کام کرتی ہی جو ایک منظم مخالفت کرتی۔ بدقسمتی یہ ہی کہ ضمیر بھی نہایت آسانی کے ساتھ

تاخر کے نظریے کی پاسداری کرنے لگتا ہی۔ مخلص اور نیک نیت لوگ اپنی اخلاقی قوت کا بیشتر حصّہ تاخر ہی کو بڑھانے پر صرف کرتے ہیں۔ اگر ایک متحرک سماجی توازن کی قسم کی کوئی چیز ہونی ہی ——— ایک حرکت پذیر استواری تو اس کا صحیح وقت اور مقام یہی ہی۔ اس کا مزاج اور صلاحیت ایسی ہونی چاہیئے کہ وہ سماجی اور اخلاقی نظر اور پذیرائی کو سماجی تبدیلیوں کے قدم بہ قدم رکھ سکے۔ اسی قسم کے ایک متحرک توازن کی تخلیق وبقا اور اخلاقی نظر اور پذیرائی کو مناسب حد تک ترقی دینا دراصل ایک موثر اور حقیقی تعلیمی نظام کے فرائض ہیں۔

خلاصہ اور اخذ نتائج

ہمارے اب تک کے غور و فکر اور مطالعے کا نتیجہ غرض یہ ہی کہ جس چیز سی جدید دنیا کی تشریح وتعبیر ہوتی ہی، اور جو اس کی خصوصیت امتیازی کو اجاگر کرتی ہی، وہ ہی آزمودہ خیال اور انسان کے معمولات میں اس کی تطبیق۔ یہ چیز ہمارے طریق بود وماند ہی میں تبدیلی نہیں پیدا کرتی بلکہ شاید اس سے زیادہ ہمارے ذہنی طرزِ عمل میں بھی فرق ڈال دیتی ہی۔ جن حالات میں ہم سانس لے رہے ہیں وہ چونکہ بالکل بدلے ہوئے اور مختلف ہیں، لہذا ہمارا عمل، ہمارا فکر اور ہمارا احساس بھی پہلے سے بالکل مختلف اور بدلا ہوا ہونا چاہیئے۔ مگر یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ آزمودہ خیال کا حجم بڑھتا رہتا ہے

اور تیور سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس سے اور زیادہ بڑھے گا حتیٰ کہ اس میں اضافہ ہندسی تناسب سے ہونے لگتا ہے۔ اگر یہ مشاہدہ صحیح ہے اور استدلال مستحکم تو پھر یہ تبدیلیاں جن کا ہم نے اب تک مطالعہ کیا ہے، آنے والی تبدیلیوں کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس تبدیلی کی حقیقت جو مستقل اور روز بروز تیز رفتار ہے، دنیا کے سامنے ایک نیا اور نہایت دشوار مسئلہ پیش کرتی ہے تہذیب کی مادّی افزونی سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ ہماری سماجی اور اخلاقی قوتیں اس کے سامنے مغلوب ہو جائیں گی۔ اور ہم اس کے لائے ہوئے مسائل سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے۔ اس کا ایک نتیجہ تو ابھی سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ہمارا نوجوان طبقہ اب استنادی اخلاق کو تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا ہمیں ایک ایسا نقطۂ نظر پیدا کرنا ہے اور ایک ایسے مربوط تعلیمی نظام کی ایجاد کرنی ہے جو اس دن پر دن بڑھنے والی تبدیلی کو نظر میں رکھے اور اس سے اطمینان بخش طور پر معاملہ کر سکے۔ اور اگر یہ نہ ہوا تو اور تو اور خود ہماری تہذیب خطرے میں پڑ جائے گی۔

باب دوم

دوسرا باب

تعلیم کی ذمّے داریاں

ایک نئی صورتِ حال

ہماری بدلتی ہوئی تہذیب، تعلیم پر نت نئے اور دوررس مطالبات عائد کررہی ہے۔ ان میں سے چند پہلے ہی سے ہمارے سامنے ہیں مگر ابھی ان کا صرف خاکہ ہمارے سامنے آیا ہے، پوری تصویر نہیں۔ قبل اس کے کہ ہم تعلیم کی ضرورت کے کیف وکم پر بحث کریں، ضرورت ہے کہ اُن مطالبات کی نوعیت پر غور کرلیا جائے جنھیں ہماری تہذیب کی بدلی ہوئی شکل نے تعلیم پر عاید کردیا ہے۔ واضح رہے کہ ہماری توجہ انھی مطالبات پر ہونی چاہیئے جو تبدیلی اور تہذیب کے نئے اقدار کے آوردہ ہیں۔ بہت سے پرانے مطالبات بھی ابھی بہت بڑی حد تک بجنسہٖ قائم ہیں۔ اگر ان کا ذکر نہ کیا

جائے تو اس کے یہ معنی نہیں سمجھنے چاہئیں کہ ان پر نظر نہیں ہے۔

ہمارے مدارس اور اُن کی تاریخ

تعلیم کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ انسان کے ابتدائی دور سے چلی آتی ہے۔ اس کا ابتدائی منصب بوڑھوں کے کام کرنے کے ڈھنگ کو نئی نسل تک پہنچا دینا تھا۔ ہم اس زمانے کو لیتے ہیں جب مدرسے نہیں تھے اور جب بچے بڑوں کی دیکھا دیکھی اور ان کے ساتھ کام میں شریک ہو کر کام کے ان طریقوں کو سیکھتے تھے جو زندگی گذارنے کے لئے ضروری تھے۔ لڑکی ہاتھ ٹپانے کا سلیقہ ماں کے کاموں میں ہاتھ بٹا کر سیکھتی تھی۔ اس فطری طریقے پر کام ہوتے ہوتے خانہ داری کے علم کو دوام حاصل ہوا، لڑکا لوگوں کو اور اپنے سے بڑوں کو کام کرتے دیکھتا تھا اور دیکھتے دیکھتے جان جاتا تھا کہ مچھلی کس طرح پکڑنی چاہیئے یا لڑنے کا موقع ہو تو کس طرح لڑنا چاہیئے وعلیٰ ہذا۔ قبیلوں میں جو جو رسمیں منائی جاتی تھیں، انھیں بچہ دیکھتا تھا اور نہ صرف دیکھتا تھا بلکہ ان میں شریک ہوتا تھا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب بچّے سے رسموں کا تعارف کرانا بجائے خود ایک رسم بن گئی اور اس طرح مدرسے کا ہیولیٰ تیار ہوا۔ اس کا اصلی کام یہ تھا کہ نوخیزوں کو قبیلے کی رسموں میں سے چند میں باضابطہ طور پر شریک کیا جائے اور انھیں ان آداب سے روشناس کیا جائے جو ان رسموں کے لئے

مخصوص تھے۔ بعض اوقات ان موقعوں پر انھیں قبائلی قصص وحکایات یاد کرائی جاتی تھیں۔ اس مدرسے کا، اگر اسے مدرسہ سمجھا جائے ——— کام یہ تھا کہ بڑے بوڑھے نوجوانوں کو قبائلی تمدن کے چیدہ چیدہ حصّوں سے روشناس کراتے تھے اور اس طرح اپنا تمدنی ترکہ نئی نسل کی طرف منتقل کرتے تھے۔

مدرسے کی ابتدا کے ساتھ ہی ساتھ تعلیم کے حصّے بھی ہو گئے۔ ایک حصے کی تکمیل گھر میں غیر مرتب اور آزادانہ طور پر ہوتی تھی اور دوسرے حصّے کے لئے مخصوص توجہ اور مقررہ وقت اور مقام کی ضرورت تھی۔ تعلیم کا اول الذکر یعنی قدیم حصہ ابھی کچھ عرصہ پہلے بھی بہت بڑی حد تک انھی مضامین پر مشتمل تھا جو پرانے زمانے میں اس کا جزو تھے۔ روزمرہ کی زبان۔ گھر کے کام۔ ذرائع معاش، اور ایسے اخلاقی اور سماجی آداب ورسوم جو جماعتی زندگی گذارنے ہی سے سیکھے جا سکتے تھے۔ یہ تعلیم نہ صرف زندگی سے قریب تھی بلکہ اس کا اہم ترین جزو تھی۔ اگر کسی سبب سے جماعت اپنی معاشرت کا کوئی پہلو بدل دیتی تھی تو تعلیم کا وہ حصّہ بھی خودبخود اس کا ساتھ دیتا تھا۔ اس لئے کہ تعلیم کا نظام ہو بہو خود زندگی کا نظام تھا۔ دوسرا حصّہ یعنی تعلیم کی نسبتاً زیادہ اقامتی[۱] شکل شروع ہی سے ضابطے اور اصول کی پابند رہی ہے۔ چونکہ ایک شعور ذات رکھنے

۱؎ Institutional

والا ادارہ تھا اس لئے اس نے نہایت آسانی سے اپنا الگ ایک حلقہ قائم کر لیا۔ اور اسی لئے اس کے درسی نظام کی تبدیلی کے لئے خارجی محرک کی ضرورت نہیں ہوتی تھی بلکہ جب اس کا ابتدائی کام ختم ہو جاتا تو وہ خود بخود تبدیل ماہیت کر لیتا تھا۔ مثال کے لئے دور نہ جائیے۔ آپ کے امریکہ ہی میں ایک ہندی قبیلے کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ ان کے یہاں ایک رسمی گیت گایا جاتا تھا جس کے الفاظ قابل فہم نہیں رہ گئے تھے قبیلے نے حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر اس کے پرانے الفاظ بدل دئے ہیں اور وہی گیت نئے الفاظ میں ڈھال لیا گیا ہے۔ گیت اپنا رسمی منصب اب بھی پورا کرتا ہے مگر اس کی حیثیت یکسر روائتی ہو کر رہ گئی ہے۔ ہونے کو تو یہ صرف ایک زندہ مثال ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو اسی قسم کا رجحان مدرسے کے درسی نظام کی تاریخ میں بھی اکثر نظر آتا ہے۔

عملی زندگی اور اس کے نظام عمل سے مدرسے کی تعلیم اور اس کے دستور کار کی علیحدگی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مدرسہ نہایت آسانی کے ساتھ ادارے کی شکل اختیار کر گیا ہے اور اس حد تک جب کہ لفظ ادارے سے اس کا بدنام مفہوم مراد ہوتا ہے۔ اس رجحان کا اثر ابتدائی مدرسے کے نصاب کے دونوں پہلوؤں پر پڑا۔ مذہبی رسم و رواج پر بھی اور قبائلی قصص و حکایات پر بھی۔ رسم الخط کی ایجاد کے بعد یہ قصص و حکایات لکھی جانے لگیں جس سے فکر کے

ارتقا کے ساتھ ساتھ ادبی مواد کے ذخیرے میں بھی اضافہ ہوا۔ اب مدرسے کا کام صرف لکھنا اور پڑھنا سکھلانے تک محدود نہ رہا۔ بلکہ اس کے فرائض کا خصوصی پہلو یہ ہو گیا کہ وہ کتابی تمدن کا یہ ذخیرہ نئی نسل کو منتقل کر دے۔ غرض جب اس نئی تعلیم کے حسب منشا سامان تیار ہو گیا اور یکے بعد دیگرے اساتذوں کی کئی نسلیں اس کے استعمال کی عادی ہو گئیں تو تبدیلی تو محال تھی۔ البتہ اسی کی طرح طرح سے جِلا دی جانے لگی۔ اور صرف یہی نہیں، بلکہ چونکہ نصاب کی وسعت اور ہمہ گیری فرصت بھی اسی مناسبت سے زیادہ چاہتی تھی، لہذا اس سے صرف چند خوش حال لوگ بہرہ مند ہو سکتے تھے، اکثریت کو پہلے زمانے کی گھریلو اور قبائلی زندگی کی بے ضابطہ تعلیم سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا، اس سے زیادہ اس نئے نصاب نے انھیں کچھ دیا بھی تو وہ بہت تھوڑا تھا۔

چونکہ مدرسے کی تعلیم اور چودھراہت کا آپس میں میل تھا، لہذا مدرسے کی تعلیم کے ظاہری اور نمایاں پہلو پر زور دینے کا رجحان عام ہو گیا اور اس کا کچھ ایسا انداز قائم ہوا کہ یہی لیڈروں کی امتیازی شان بن گئی اور ان کے پیرو بھی اس سے متاثر ہونے لگے[1]

---

[1] انگلستان کا "پبلک اسکول" اپنی مخصوص "پبلک اسکول اسپیچ" اور دوسرے ظاہری اوصاف کی مناسبت سے بالعموم اس رجحان کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ ہماری کوتاہ بینی ہوگی اگر ہم خود اپنے گھر میں اسی چیز کی متعدد مثالوں سے بے خبر رہیں گے۔

مدرسے کا دوسرا ابتدائی مقصد، بچوں کو جماعت کے اخلاقی و سماجی (مذہبی اور سیاسی) تمدن سے روشناس کرانا ——— بھی یکساں طور پر اسی رجحان سے ہم آغوش ہوا اس پر بھی ادارے اور روایات کا رنگ چڑھ گیا۔ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں بالکل یہی وہ مقام ہے جہاں کسی جماعت کی قدامت پسندی نمایاں نظر آنے لگتی ہے جماعت کی معینہ رائے کے پرستاروں اور علمبرداروں کے نزدیک مدرسہ پختگی رائے کو دوام بخشنے کا ہمیشہ سے ایک نہایت کارآمد ذریعہ رہا ہے اور اگر اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس کی نگرانی کی جائے تو بلاشبہ وہ ہے بھی نہایت کارآمد۔ چنانچہ مدرسے کو "قدامت پسند" اور روایات پرست بنانے میں تین رجحانات کی کارفرمائی رہی ہے:۔ اوّل خود نظام کا جمود اور بے حسی، اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا متعدی مرض، دوم علم کے ظاہری اوصاف پر زور دینے کا اثر، جو اپنا تعلق ان محرکات سے قائم کرتا ہے جو آگے چل کر روائتی مواد کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور سوم مدرسے کو اس نظر سے استعمال کرنے کا امکان کہ بچوں میں اپنی پسند کے افکار و آداب کی روح پھونکی جائے جسے (یعنی اس امکان کو) قدامت پسندوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ ان تینوں رجحانوں نے ایک دوسرے کی ہمیشہ تائید کی ہے اور ایک دوسرے کو تقویت دیتے رہے ہیں۔ یہ بات اتنی صاف اور ظاہر ہے کہ اس کی تشریح کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ابھی ماضی قریب تک

تبدیلی کے منکر کی حیثیت سے مدرسہ بہ حیثیت مجموعی سماجی تبدیلی کے خلاف ایک آہنی فصیل کا کام کرتا رہا ہے۔

واقعات کے حق میں یہ بڑی بے انصافی اور غلط فہمی پیدا کرنے والی بات ہوگی اگر ہم یہاں اس حقیقت کو نظر انداز کر دیں کہ دنیا کے مدرسے اب تک تبدیلی کی مخالفت میں ایک نہایت مستحکم محاذ قائم کئے ہوئے ہیں۔ گذشتہ صدی اور اس سے کچھ پہلے کے زمانے میں حالات کے مطابق کچھ ادل بدل نظر آتا ہے اور اس مطابقت پذیری کے معاملے میں افکار کا جمود بھی بہ حیثیت مجموعی روز بروز نرم پڑ رہا ہے۔ آگے چل کر پروگرام کے تحت میں جو تجاویز پیش کی جائیں گی ان کی بنیاد بھی بیشتر نہایت قطعی رجحانات پر ہوگی۔ لیکن اب تک جتنا کچھ بھی کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ ابھی کرنا ہے۔ ابھی تک تبدیلی کی حقیقت کا محض بادلِ ناخواستہ اعتراف کیا گیا ہے۔ گذشتہ باب کا استدلال اگر مان لیا جاتا ہے تو مدرسے کو ان تبدیلیوں کے مناسب حال جو ہماری سماجی زندگی میں بہت پہلے سے اثر انداز ہو رہی ہیں، نہ صرف ایک نئی شکل اختیار کرنی ہوگی بلکہ ہمیں اپنے بنیادی نظریۂ تعلیم کو ایک ایسے قالب میں ڈھالنا ہوگا جو روز افزوں تبدیلی کی ابدی حقیقت کو بنیادی اور قوی عنصر کی حیثیت سے تسلیم کرے۔ اس حقیقت کو ہمارے مدارس کے اہتمام و انصرام کی بنیاد کے طور پر ہنوز کما حقہٗ تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

بچوں کو خود سوچنے کی آزادی

نئے مطمحِ نظر کا ایک پہلو یہ ہے کہ بچوں کے فکر کو پابند بنانے کا حق جواب تک ہم نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے ترک کر دیا جائے۔ تعلیم کا شاید نہایت مفید تصور یہ ہے کہ اسے ایک عمل سمجھا جائے جس کے ذریعے ہم برتاؤ کے آداب سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ "برتاؤ" کے لفظ سے میری مراد اس کا وہ وسیع اور ہمہ گیر مفہوم ہے جس میں بول بات کے ظاہری اوصاف کی طرح ہمارے عقائد اور طرزِ عمل بھی شامل ہیں۔

اوّل اوّل بچے برتاؤ کے بالکل وہی آداب سیکھتے تھے جو قبیلوں میں رائج ہوتے تھے اور انھیں وضاحت کے ساتھ سکھانا بوڑھوں کا اولین فرض سمجھا جاتا تھا۔ ہماری تعلیم کے باضابطہ اور بے ضابطہ دونوں پہلو اب تک اسی نقطۂ نظر کے پابند تھے۔ تعلیم نام تھا ایک عمل کا جس کے ذریعے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں معاملات کی باگ تھی، نئی نسل کے فکر و عمل کی تعیئن کرتے تھے۔ اور شاید ہمارے ملک میں اس وقت بھی ایسے بہت سے والدین ہوں جو اپنے بچوں کے ذہنی اور اخلاقی مستقبل کے تعیّن کا حق اپنے لئے مسلّم اور شک و شبہے کے امکان سے مبرّا سمجھتے ہیں۔ والدین تو والدین، بہت سے نام نہاد قومی پراگراموں کی بنیاد بھی اسی قسم کے حق پر ہوتی ہے اور یہ

عقیدہ اسی ارسطاطالیسی فلسفے کا محض مثنیٰ ہے جو اب تک ہمارے افکار پر حاوی تھا اور جس کی رو سے اصول میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس نظریے کے ماتحت انسان کو انھی اصولوں سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے اور بس اس کے مطابق بچوں کو جو کچھ جاننا چاہیئے وہ پہلے سے جانا اور بوجھا ہوا ہے۔ اور یہ واقفیت والدین کے پاس محفوظ ہے ——— اگر بلا استثنا تمام والدین کے پاس نہیں تو کم سے کم ان کے مشیروں کے پاس۔ والدین اور دوسرے بالغوں کے اس حق میں کہ بچے انھی کی متعین کی ہوئی باتیں سوچیں معقول نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ان روز بروز تبدیل ہونے والے حالات میں ہم اپنی کوششوں کے باوجود یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتے کہ ہمارے بچوں کو کس قسم کے فکر کی ضرورت ہوگی اور اسی لئے تبدیلی کے نئے فلسفے اور اس کے اخلاق کے پیش نظر با اختیار لوگوں کو اس قسم کی نگہبانی کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ موجودہ نسل میں خود سوچنے اور فکر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیں اور اس حد تک کہ اگر آخر میں وہ فیصلہ کریں کہ خود ہمارے فکر میں تبدیلی یا نظر ثانی کی ضرورت ہے تو وہ اپنے فیصلے پر عمل بھی کریں۔ ہمارے مقررہ عقاید کے لئے یہ نہایت صبر شکن آزمائش کا وقت ہے۔ اگر وہ اس قابل ہیں کہ باقی رہیں تو ممکن ہے اس آزمائش کو جھیل لے جائیں۔ اور اگر ان میں اس آزمائش کو جھیلنے کی طاقت نہیں ہے تو ان کا فنا ہو جانا یقینی ہے۔ غرض دنیا کی آنکھوں پر پردہ سا

پڑا ہوا ہی۔ اس پردے کے ہٹتے ہی بچوں کے دماغ پر اپنے افکار و نتائج کو نافذ کرنے کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہی۔ ہمیں اپنے بچوں کو اپنے آپ سوچنے کی آزادی دینی ہو گی۔ اس کے علاوہ کوئی اور اصول نہ صرف یہ کہ مستقبل کی آئے دن بدلنے والی اور نامعلوم ہیئت سے وابستہ واقعات پر پردہ ڈالنے کے مرادف ہوگا بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس کے معنی جمہوریت سے انکار کے ہوں گے جس کا بنیادی مطالبہ یہ ہی کہ دوسروں کا حق کہ اپنے بچوں تک کا احترام کرو۔

پرانی تعلیم کی ناموزونیت

نئے مطالبات پر غور کرنے سے پہلے اچھا ہوگا اگر مروجہ تعلیم کے اعمال ناموں کا جائزہ لے لیا جائے۔ اس پرانی تعلیم کا دعویٰ یہ ہی کہ نوجوانوں کو آئندہ زندگی کے لئے تیار کرتی ہی۔ اس کی ناکامی کے دو پہلو ہیں۔ اول تو یہ زندگی کی موجودہ روش ہی کے لئے تیار کرنے میں ناکام رہی ہی اور دوسرے اس نے اس زندگی کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہی جس سے نوجوانوں کو ایک غیر معین مستقبل میں دوچار ہونا ہی۔ بجائے اس کے کہ یہ موجودہ زندگی کے لئے بھی بچوں کو تیار کرتی، اس نے اس مقصد کے بالکل برعکس انھیں ان چیزوں کی تعلیم دی ہی جو بالکل متروک ہو چکی ہیں اور جن کی حیثیت محض روایتی ہو کر رہ گئی ہی۔ اس کا یہ طرز عمل کچھ تو اس وجہ سے رہا ہی کہ اس کا تنگ نظر

فلسفہ اسے نئے مطالبات سے ہم آہنگ ہونے کی اجازت نہیں دیتا، کچھ اس وجہ سے کہ اس کا رشتہ خود غرضانہ سماجی مفادات سے قائم ہی اور اس لئے اس نے تعلیم کے روائتی پہلوؤں کو سماج کی صحیح خدمت پر ترجیح دی ہی۔ اور کچھ اس سبب سے کہ اس کی کج فہمی اور کور باطنی سماجی اور اخلاقی تأخّری کو مقدم سمجھتی ہی اور اس سے کچھ سروکار نہیں رکھتی کہ سماجی ماحول کا اب کیا رنگ ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ مستقبل کی نامعلوم اور بدلتی رہنے والی ماہیت سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے بچوں کو اپنے بس بھر اچھی سے اچھی تعلیم دیتی، اس نے اپنے جمود کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ بہانہ تراشا ہی کہ مستقبل بھی حال ہی سے مشابہ ہوگا۔ ایک وقت تھا جب ترقی کی رفتار اتنی کم تھی کہ نئی نسلوں کو بھی بالکل انھی حالات سے سابقہ پڑتا تھا جو ان کے باپ دادا دیکھ چکے ہوتے تھے۔

اس زمانے میں اِس یک رنگ ماحول سے بنے تُلے انداز میں مطابقت پیدا کرنے کے مسئلے کی حمایت کی جاتی تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اس لئے کہ اگر کچھ اور نہیں تو کم سے کم حالات کا ظاہری رُخ ہی اس حمایت کی تائید میں ہوتا مگر جب صورت یہ ہو کہ تبدیلی دن دونی رات چوگنی ترقی کے ساتھ ایک خوفناک دیو کی طرح ہمارے وجود پر مسلّط ہی، ہمارا اسی ایک حال سے رشتہ بنا رہنا اعانت نہیں، ایک قسم کی خیانت ہی۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ ہم خود تبدیلی کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری کوششوں کو صحیح راستے پر

لگانے کے لئے اس استواری کی ضرورت ہے جو حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔
غرض تعلیم کے سامنے ایک بالکل نیا مسئلہ ہے اگر نوعی نہیں تو کم از کم نسبتی۔ لہذا پرانے قسم کے محدود اور رسمی مضامین کے ذخیرے میں سے جن مضامین کو اس نسل سے دوسری نسل تک زندہ و سلامت پہنچانا ہے تو ان میں فکر و عمل کے چند ایسے مسلمات بھی شامل کرنے پڑیں گے جو نسبتاً زیادہ مناسب وقت ہیں اور خاص کر نئے حالات و واقعات سے دوچار ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ ان کی ترتیب و تنظیم کو جتنا زیادہ سے زیادہ ہو سکے نئے ماحول کے مطالبات سے قریب تر رکھنا پڑے گا۔

نئے حالات کے تعلیمی مطالبات

ہم نے پرانی تعلیم کے نقائص کا جائزہ بھی لے لیا اور نئی تعلیم کے متعلق پیش بینی بھی کر لی۔ اب اس نئی تعلیم پر تفصیلی بحث سے پہلے نہایت وضاحت سے یہ دیکھنا ہے کہ نئے ماحول کے خاص خاص مطالبے کیا ہیں۔

پہلا اور نہایت نمایاں مطالبہ تعلیم کے بے ضابطہ پہلو کی روز بروز بڑھتی ہوئی ناکامی کی پیداوار ہے صنعتی دور سے پہلے تعلیم کا یہ پہلو جس کی تکمیل کنبے اور قبیلے کے ساتھ مل جل کر رہنے سے ہوتی تھی، اور جو قدیم زمانے سے ورانتاً چلا آتا تھا، اپنے عمل اور اثر کے لحاظ سے ہر ملک اور ہر زمانے میں

بغیر کسی امتیاز کے یکساں رہا مگر صنعتی دور کے آغاز کے ساتھ ساتھ اس میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی جو خاص کر اس ملک میں بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ کہانی ہے تو بہت پرانی مگر یہاں بھی اس کا خلاصہ بیان کر دینا ضروری ہے۔ کنبہ بحیثیت ایک معاشی ادارے کے بہت بڑی حد تک بدل چکا ہے اور اسی مناسبت سے اس کی تعلیمی قدر بھی کم ہوگئی ہے۔ پرانا کنبہ جس میں اگر کچھ کمی رہ جاتی تھی تو وہ پڑوس کی مل اور لوہار خانے سے پوری ہو جاتی تھی، صنعتی کاموں کے ضروری حصّوں سے ہمیشہ باخبر رہتا تھا۔ یہ کام ایک ایک کر کے کارخانے میں منتقل ہوگئے ہیں یہاں تک کہ ——— اگر ہر جگہ نہیں تو کم سے کم شہر میں خوش حال والدین کے بچے معاشی قوانین کی ابتدائی معلومات سے بھی بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ اپنے والدین سے ان کے تعاونی تعلقات بھی بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔ باپ قریب قریب تمام دن باہر کام پر رہتا ہے اور خود بچہ بھی دن کا بڑا حصّہ مدرسے میں اور سہ پہر کا وقت کھیل کے میدان میں گذارتا ہے۔ رہا شام کا وقت تو وہ اکثر اوقات "گھر کے کام" میں گذرتا ہے (جس میں باپ شاذونادر ہی اس کی کوئی مدد کرتا ہوگا) یا پھر بائسکوپوں، موٹر کی سواری میں، اور اگر خیر سے اماں بھی باہر کام پر جاتی ہیں تو حالت اور بھی بدتر ہو جاتی ہے غرض نوبت اب یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ گھر کی حیثیت کم ہوتے ہوتے ایک سرائے کی ہو کر رہ گئی ہے جہاں دن بھر کا تھکا ہارا بچہ ایک اجنبی مسافر

کی طرح اگر سو رہتا ہو۔ اپنی پرانی حیثیت کے مقابلے میں تو یہ اس کی بدترین شکل ہے۔ دوسری حیثیتوں سے یہ حالت بہتر بن بھی مگر کسی حال میں تعلیمی قدر کے اعتبار سے اس کی وہ حیثیت نہیں ہے جو کسی زمانے میں اسے ایک ادارے کی حیثیت سے حاصل تھی اور جس کے ذریعے بچے کو صنعتی کاروبار سے روشناس کرایا جاتا تھا یا اُسے معاشی و سماجی نظام عمل سے متعارف کرایا جاتا تھا یا اس کے اندر سماجی اور اخلاقی آداب کے وہ تعاونی اوصاف پیدا کیے جاتے تھے جو سماجی زندگی کے لئے ناگزیر تھے۔

جماعت کی تعلیمی قدر بھی گھٹنے سے کسی قدر مختلف انداز میں بہت کچھ گھٹ گئی ہے۔ ایک طرف اس میں امنگ اور ولولے کے محرکات پہلے کی بہ نسبت زیادہ پیدا ہو گئے ہیں اور اپنے ساتھ طرح طرح کے تعلیمی اثرات بھی رکھتے ہیں جو اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ مگر دوسری جانب ان میں سماجی زندگی کے بنیادی طور طریق خواہ وہ صنعتی ہوں یا معاشی، سیاسی ہوں یا اخلاقی، پہلے کی بہ نسبت بہت کم نظر آتے ہیں جدھر دیکھئے "اندر آنے کی اجازت نہیں ہے" اور اسی قسم کے دوسرے تنبیہی فقرے آویزاں نظر آتے ہیں گویا نوجوانوں کے جوشِ تحقیق و جستجو کے لئے جدید زندگی نے اپنے دروازے بند کر لئے ہیں۔ دودھ کی مثال لیجئے اور دیکھئے کہ اس کی صنعت کے اجزا ایک دوسرے سے اس طرح جدا ہیں کہ ایک شہری بچے کو اس کی کلی ہیئت شاید ہی کبھی نظر آئے۔ جوں جوں اشیاء کی پیچیدگی بڑھتی جاتی ہے ایسے

اجزا ایک دوسرے سے الگ ہوتے جاتے ہیں، اور ان میں سے بشتر ہماری آنکھوں سے اس قدر پوشیدہ ہوتے ہیں کہ ان کا شعور مشکل ہو جاتا ہے، شعور کے بغیر کسی معاملے میں تعاون اور باہمی مفاہمت محض ناممکن ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سماجی نقطۂ نظر کا پیدا ہونا مشکل ہو جاتا ہے اور خود غرضانہ انفرادیت آسانی سے دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔

بے ضابطہ تعلیم کے اداروں کی ناکامی نے نوعیت اور درجہ دونوں حیثیتوں سے مدرسے کے فرائض میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ بچے کی زندگی سے والدین جتنے ہی زیادہ غیر متعلق ہوتے جاتے ہیں، مدرسے اور دوسرے تربیتی اداروں کو لازم ہے کہ اسی نسبت سے بچوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رہنے سہنے کا اصول اختیار کریں۔ زیادہ زور رہنے سہنے پر دیا جانا چاہیے (اس ملک کے) پرانے مدرسے خالصتاً تعلیمی ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اصل زندگی مدرسے سے الگ کہیں اور ہی بسر ہوتی تھی۔ مدرسے کا کام محض اس زندگی میں چند علوم و فنون کا اضافہ کر دینا تھا۔ مگر دورِ حاضر کا مدرسہ زندگی کی جولانگاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر رکھتا نہیں ہے تو اسے رکھنا چاہیے۔ بہتر زندگی گذارنے کا سلیقہ زندگی کو عملی طور پر گذار کر ہی سیکھا جا سکتا ہے۔ جس چیز کو کچھ لوگ غلطی سے "خبط اور خود نمائی" سے تعبیر کرتے ہیں وہ اگرچہ ابھی اندھے کی لکڑی ہی سہی، مگر مدرسے کی طرف سے ایک کوشش ہے عہد طفلی سے اس ضروری عنصر کی فراہمی کی۔ سماجی اور اخلاقی آداب و اطوار کی تعمیر اور زندگی کے مسائل اور مہمات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جن طریقوں کی ضرورت ہے، ان کا ارتقاء اسی وقت

اور صرف اسی وقت ممکن ہی جب مدرسے کا نظام عمل رہن سہن پر مبنی ہو غرض جماعت اور کنبے کی شکست وریخت کے سبب سے مدرسے کی تعلیم نوعیت اور درجے دونوں لحاظ سے بالکل بدل جاتی ہی۔

اب رہیں تعلیم کی دوسری نئی ذمہ داریاں تو اگر ہم پچھلے باب کا ایک خاکہ اپنے سامنے رکھیں تو ان کی تلاش وتحقیق میں آسانی رہے گی اس لیے کہ گذشتہ باب میں ہم نے اس بدلے ہوئے ماحول کی ایک تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہی جس سے ہمیں آئے دن سابقہ رہتا ہی۔

سائنس کی تعلیم نئی صورت حال کا ایک مطالبہ ہی

نئی زندگی میں آزمودہ خیال کی عظمت و اہمیت اپنے ساتھ مطالبے بھی رکھتی ہی اور موقع بھی۔ اگر یہ صحیح ہی کہ سائنس اس قسم کے نتائج پیدا کرسکتی ہی، تو اس نئے منطقی نظام کے امکانات سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی ناسمجھی ہوگی۔ سائنس کی تعلیم کی ضرورت نئی نہیں ہی بلکہ اس ضرورت کو پورا کرنے میں ہم نے جتنی کامیابی حاصل کی ہی، وہ فکر بیدار کے نزدیک قابل گرفت ہی۔ توہم پرستی کا غلبہ اب بھی قائم ہی۔ اس یقین کے باوجود کہ جدید سائنس نے اونچے سے اونچے محلات کی تعمیر کو ممکن بنا دیا ہی، لوگ اپنی اوہام پرستی کے ماتحت "تیرہ" منزل کا مکان بنانے سے گریز کرتے ہیں، یہ ایسی حقیقت ہی کہ تعلیم اسے نظر انداز نہیں کرسکتی۔ اگر کوئی کہتا ہو کہ نہیں "، یہ سب توہمات محض مضحکہ خیز ہیں، تو اُسے چاہیے کہ وہ اپنے مخصوص تعویذ گنڈوں اور سامدرک کے پھلتے پھولتے ہوئے

فرقوں کا مطالعہ کرے (اور انھی کی زبانی ان کی کہانی سنے) پھر ڈیٹن۔ (DAYTON.) ٹینیسی (TENNESSEE.) اور انھی کے ان لاتعداد بھائی بندوں کو ملاحظہ فرمایئے جو نہ تو اب تک خیالات و افکار کو خود پرکھنا سیکھ سکے ہیں اور نہ یہی مانتے ہیں کہ یہ طریق عمل ایک بھروسے کی چیز ہی۔ سچ پوچھئے تو ہم ابھی سائنس کی تعلیم میں کامیاب ہی نہیں ہوئے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہی جن کے ہاتھوں فکر کو معراج حاصل ہوتی ہی۔ ہمیں اپنی اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے علوم اجتماعی میں بھی آزمودہ خیال کا اصول برتنا ہوگا اور اگر خوش قسمتی سے ہو سکے تو اسی حد تک جس حد تک ہم نے علوم طبعی میں اس اصول کو برتا ہی۔ مزید براں جمہور کی بھاری اکثریت کو جو فکر میں اس طریقے پر اضافہ کرنے سے قاصر رہی گی، چاہیئے کہ ان سائنٹفک طریقوں کو دیکھنا، سمجھنا اور ایک حد تک ان کے مطابق عمل کرنا سیکھے۔ اگر کچھ نہیں تو کم سے کم وہ اتنا تو کریں کہ ان طریقوں پر طنز نہ کریں، جیسا کہ آج کل عام طور پر ہوتا ہی۔ بلکہ انھیں دیکھیں اور غور کریں تا آنکہ انھیں یقین آجائے غرض سائنس کی تعلیم میں ہمیں کامیاب ہونا ہی۔

تنقیدی افتاد کی ضرورت

اگر سائنس کے عروج نے ان اداروں اور مذاہب فکر پر جو قدیم زمانے سے اب تک مسلّم و مستحکم چلے آتے ہیں، جرح کرنے کا میلان پیدا کر دیا ہی، جو واقعی حقیقت ہی، تو اس کا تقاضا یہ ہی کہ تعلیم حسب امکان لوگوں میں پرکھ کا مادہ

پیدا کرے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہو سکتا ہے کہ تخریب کے ہاتھوں تعمیر کا جنازہ نکل جائے۔ تبلیغ و اشاعت کے ذرائع میں اتنی ترقی ہو گئی ہے کہ اتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی اور بھلا ہو اس کے طریقوں میں ان تجربات کا جو نہایت محویت و انہماک سے کئے جاتے رہے ہیں، کہ ان کی بدولت اس کا اثر غیر معمولی طور پر بڑھ گیا ہے اس کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ اس سے نپٹنے کے لئے ہم اپنے اندر تنقید کا معقول مادّہ پیدا کریں۔ ذرائع رسل و رسائل کی غیر معمولی ترقی سے اس مطالبے کی شدت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ عوام کے ذہن کو اب باتیں سننے اور سمجھنے کے لئے گوشت و پوست میں ایک جگہ جمع ہونے کی ضرورت کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ سینما، مصوّر اخبارات اور ریڈیو نے جسمانی تعلق کی ضرورت کو قریب قریب ختم کر دیا ہے۔ جنگ عظیم سے ہمیں ایک تلخ سبق یہ ملا ہے کہ عوام کے جذبات کو جس وقت ضرورت ہو، پوشیدہ ترکیبوں سے بڑی سہولت کے ساتھ مشتعل کیا جا سکتا ہے۔ سماج کو ان جدید قسم کے بہکاووں کا مقابلہ کرنے کی ترکیب سوچنی ہے۔ تہذیب کے لئے جس حد تک حرکت پذیر بنیاد کی ضرورت ہے اور اس استواری کے قیام کی حاجت جو حرکت سے پیدا ہوتی ہے اسی حد تک ہمارے فکر میں سلیقے اور ستھرے پن کی بھی ضرورت ہے۔ صرف باسلیقہ فکر ہی ہمارے سماج میں لچک اور توازن پیدا کرنے کی ضمانت کر سکتا ہے۔ لہذا نئے حالات کی تجویزوں اور مشوروں کو سننے اور سمجھنے کے لئے ہمیں جہاں وسیع النظری کی ضرورت ہے، وہاں انھیں تولنے اور پرکھنے کے لئے کسوٹی کی سی صفت کی بھی ضرورت ہے۔

دنیا کی روز بروز بڑھتی ہوئی صنعیت نے ہمارے سامنے اتنے بے شمار مطالبے رکھ دئے ہیں کہ اگر ہم ان میں انتخاب کریں تو اندیشہ ہو کہ کہیں ان گوناگوں پیچیدگیوں میں ہم اپنا راستہ ہی نہ کھو بیٹھیں۔ اس موقع پر صنعیت کے تین پہلو ہمارے غور و فکر کے لئے کافی ہوں گے۔ مہارتِ خصوصی، اجتماع اور سالمیت (INTEGRATION)

مہارت خصوصی کا تعلیمی مطالبہ

اس امر میں شاید ہی کسی کو شبہ ہو کہ صنعت میں مہارت خصوصی کا پہلو اپنے دامن میں چند بہت مہلک خطرات چھپائے ہوئے ہے۔ ہر مزدور اپنے کام کے لحاظ سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھا رہتا ہے۔ تعلیم کو اس بات پر نظر رکھنی ہے کہ کہیں اس کے کام کی تنگی اس کی ذات میں بھی تنگی نہ پیدا کردے۔ ایک شخص کے پیشے میں مطمئن زندگی اور سکون بخش فکر کا جس قدر فقدان دیکھا جائے، اس کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں اسی قدر زیادہ راحت و سکون موجود ہونا چاہیئے۔ مدرسے کو اس لحاظ سے دوسری سَستانہ راہیں اختیار کرنی چاہئیں۔ خود سماج کی تعمیر اس پیرائے میں کی جائے کہ وہ ایک ہمہ گیر وجود ہے اور اس کے تعلقات کا دائرہ نہایت وسیع۔ افراد کی مخصوص دلچسپی کا تعین اس نظر سے ہونا چاہیئے کہ اس کے ذریعے وہ زندگی کو اس کے بے شمار لاحقوں کے ساتھ دیکھ اور برت سکے۔ زندگی کے ایک جزو کا دوسرے سے اس طرح جوڑ ملائے کہ وہ باہم ایک ذات ہوجائیں۔ علاوہ ازیں مہارت

خصوصی کے ساتھ ساتھ زندگی میں گوناگوں دلچسپیاں بھی پیدا کرنی ہوں گی دلچسپی کی ایک ہی راہ قدرتاً ذہن میں تنگی پیدا کر دیتی ہے۔ پھر کام کی بہت سی قسمیں ایسی ہیں جن میں اطمینان و راحت کا شائبہ تک نہیں رہ گیا ہے۔ لہذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ زندگی ہر ایک کے لئے اطمینان بخش اور راحت فزا ہو تو ہمیں اس میں بے شمار دلچسپیاں پیدا کرنی ہوں گی۔ مگر اتنا ہی کافی نہیں ہے مہارت خصوصی کا نتیجہ چونکہ طبقہ وارانہ تعلقات کی افزونی کی شکل میں نکلتا ہے، لہذا اس کے اثر سے اجزا میں اپنے کل سے ایک خود غرضانہ جذبۂ نفرت پیدا ہو جاتا ہے نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے درپے ہو جاتا ہے اور ایک طبقہ دوسرے طبقے کا دشمن۔ سماجی کل نظر اور ارادے سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ تو اس ربط باہمی کا محض سماجی اور اخلاقی پہلو ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ ہمیں بہرحال کسی نہ کسی طرح ایک ایسی راہ نکالنی ہے کہ مہارت خصوصی کے باوجود ہمارے اندر خود غرضی راہ نہ پائے بلکہ اس کی جگہ باہمی تعاون کا جذبہ پیدا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مسائل مستقل اور دشوار ہیں مگر یہاں تو صنعتیت کو جس قدر فروغ ہوتا ہے اسی قدر ان مسائل کی شدت اور دوام میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ نظر میں وسعت، ایک کے کام کی بقیہ سماجی نظام سے وابستگی کا سچا احساس، سماجی کل میں جاذب نظری اور تعاون کی صفت، زندگی کی دلچسپیوں میں اضافہ وہ شدید مطالبات ہیں جنھیں ترقی پذیر صنعتیت ہماری زندگی پر عاید کرتی ہے اور زندگی کے رشتے سے ایک معقول تعلیمی اسکیم پر بھی ان کا اثر پڑنا قطعی ہے۔

اجتماع کا تعلیمی مطالبہ

مہارت خصوصی ہی سے مربوط صنعیت کا ایک پہلو اجتماع ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اس کی وسعت میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ ایک وقت وہ آتا ہے جب اس کی وسعت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ اس کے زیر اثر مطالبات کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ اول تو ہمیں ایسے اشخاص کی ضرورت ہے جو اتنے بڑے ہوں کہ بڑے بڑے معاملات کی ذمے داری لے سکیں، اتنے بڑے کہ انھیں ایسی آمادگی اور ہوشیاری کے ساتھ انجام دے سکیں جو معاشی نظام عمل میں نظر آتی ہے یا اتنے بڑے کہ انھیں انسانی زندگی کے کار فرما حقائق کی اہمیت کا کافی احساس ہو۔ پہلے دونوں کام تو ہیں ہی مشکل مگر یہ تیسرا ان سب سے مشکل ہے اور شاید ان سب سے زیادہ ضروری بھی۔ جب تک انسان اپنے کاموں کو اس طرح چلانے کا سلیقہ نہیں سیکھ جاتا جو زندگی کو بہتر بنانے میں ممد ہو سکے۔ اس وقت تک تہذیب اپنی بنیادی کارکردگی کا ثبوت دینے سے قاصر ہے۔ مصنوعات کی بڑے سے بڑے پیمانے پر تیاری ہی صرف کافی نہیں ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ جس طرح سچے دل سے اپنے کام پر لگا رہتا ہے اسی طرح سچے دل سے اس کام سے الگ ہو کر بھی سوچے۔ اس لیے کہ زندگی ہی کی انجنیری وہ اہم انجنیری ہے جو صحیح معنی میں تہذیب کی عمارت اٹھا سکتی ہے۔ یہ تو ہوئی ان لوگوں کی بات جنھیں رہ نمائی کرنی ہے مگر ان لوگوں کا کیا ہوگا جو پیچھے چلنے والے ہیں؟ اگر ہمیں ان لوگوں کا خیال رکھنا ضروری ہے جنھیں اجتماع کی اس ترقی پذیر حالت میں رہ نمائی کرنی ہے تو اسی طرح ان لوگوں کا بھی پاس رکھنا

لازمی ہے جو عوام میں شامل ہیں۔ اس لئے کہ اس شور اشوری میں ان کے ذہنی اور روحانی دونوں حیثیتوں سے بہہ جانے کا اندیشہ ہے۔ اگلے وقتوں میں لوگ اپنے روزمرہ کے کام میں فکر وعمل کی اہم سے اہم ذمے داریوں کو تنہا محسوس کرتے تھے اور ان سے عہدہ برآ بھی ہوتے تھے۔ مگر اب یہ بات نہیں ہے۔ اب فرد روز بروز کثرت میں گم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور یہی اس کا اصل نقصان ہے۔ چھوٹے حلقے میں فرد کو جو حیثیت حاصل ہوتی ہے، وہ اسے بڑے حلقے میں حاصل نہیں ہوتی۔ یہ کلیہ جس طرح کارخانے یا دفتر اور اس کے امور پر صادق آتا ہے، اسی طرح شہر اور اس کے معاملات پر بھی صحیح اترتا ہے۔ اب فرد کے فکر کے بارے میں دیکھ لیجئے یا اس کے ذاتی اثر کے بارے میں، وہ پہلی سی حالت نہیں رہی۔ بہت سے لوگ تو دماغی اور روحانی نیستی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس صورت حال پر قابو پانے کی تدبیر کا سمجھ میں آجانا آسان کام نہیں ہے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ مطالبے کی شدت ہماری زندگی کے اطمینان وسکون ہی کو ختم کئے دے رہی ہے۔ مدرسے کا فرض ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی شخصیت کو محسوس کرانے اور اس ہمہ گیر وسعت پر قابو پانے میں لوگوں کو سہارا دے۔ یہ وسعت دولت آفرینی کو تو ہوسکتا ہے کہ کہیں سے کہیں پہنچادے مگر فرد کے حق میں ایک بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ ہے۔ مدرسے کو اس خطرے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں فرد کی مدد کرنی ہوگی۔

سماجی سالمیت کا تعلیم پر مطالبہ

سماجی سالمیت کے مطالبات کی نوعیت دوسری ہے، چونکہ انسان اور اس کے مسائل روز بروز ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے جا رہے ہیں، ایک فرد دوسرے افراد سے، ایک گروہ دوسرے گروہوں سے اور ایک قوم دوسری قوموں سے، لہٰذا بمقتضائے وقت اب ایک ایسے مطمح نظر کی ضرورت ہے جو اس دوررس اور وسعت پذیر وابستگی کی رعایت رکھے۔ نظر کی عالمگیریت سے کم کسی اور چیز سے کام نہیں چل سکتا۔ نظر کی عالمگیریت! یعنی ایسی صلاحیت جو سماجی مسائل کو اسی پیمانے پر دیکھ سکے جس پیمانے پر وہ دراصل ہیں۔ اس ملک میں اس مطالبہ کی خاص طور پر بڑی اہمیت ہے۔ دنیا کے باقی حصّوں سے ہمارے جغرافی بُعد اور ہماری خود آسودگی نے ہمیں اس قدر بے حس کر دیا ہے کہ اس نئی صورت حال کا ہمیں ابھی کافی احساس بھی نہیں ہے۔ ہم جس قدر جلد ان حقائق کا نہایت صفائی کے ساتھ اعتراف کرلیں اتنا ہی دنیا کے لئے اور خود ہمارے لئے بہتر ہوگا۔ ایک ہی چیز کو لے لیجیے، ہمارا مروجہ قومیت کا تصور اور ہمارے جذبات کی شدت جو اس تصور سے وابستہ ہے، ہمیں زندگی کے حقائق سے ہم آغوش نہیں ہونے دیتی۔ قومیت کا محض ایک نظریئے کی حیثیت سے سمجھنا اور اس کے بارے میں یہ سُننا کہ ایک نظریئے کی حیثیت سے اسے زندگی کے حقائق سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے اکثر اصحاب کے لئے ایک بالکل نئی بات ہوگی۔ یہ حضرات بڑے شوق سے اپنی قومیت کو "حبّ وطن" سے تعبیر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح یہ ان

بدگمانیوں کی حدود سے اونچی اٹھ جاتی ہے جن کا واقعات اسے ملزم ٹھیراتے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک، بہ استثنائے چند جو بغاوت کے عادی ہوتے ہیں، یہی حقیقتِ مطلق بن جاتی ہے جس کے سامنے دوسری تمام حقیقتوں اور دوسرے تمام انسانوں کو سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیئے اس لئے کہ اس کا رشتہ مختلف راہوں سے گذرتا ہوا صفاتِ ربانی سے جا ملتا ہے۔ مگر جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں، قومیت کا یہ تصور ایک تاریخ رکھتا ہے۔ قومی فرمانروائی کی مطلقیت کا تصور دنیا کے لئے نبتاً نیا ہے۔ اور باہمی وابستگی اور ارتباط کی اس دنیا میں یہ ایسا ہی ناقابلِ عمل ہے، جیسا فرد کے مطلق العنانہ اختیارِ کامل کا تصور۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اس بات کو نہیں مانتے کہ ایک واحد شخص جو سماج کے ساتھ رہتا ہے اور سماجی رشتوں سے وابستہ ہوتا ہے، اپنے کردار کا خود ہی حکم بن سکتا ہے یا یہ کہ ریاست کی طرف سے کسی حالت میں اس کے اوپر پابندی عاید کرنا اس کے اس حق کو غصب کرنے کے مرادف ہے جس کے ماتحت وہ اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق جو چاہے فیصلہ کر سکتا ہے اور جس طرح چاہے عمل کر سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انسانوں کے بارے میں بعض صاحبان کا یہی عقیدہ ہے اور جس کی رو سے وہ ریاست کو کسی پر سختی کرنے کا حق دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس عقیدے کے پیرو نراجی ہیں۔ یہی وہ اپنے آپ کو کہتے ہیں اور در اصل ایسے ہی ہوتے بھی ہیں۔ ان کے نزدیک ہر شخص مختارِ مطلق ہے۔ اور اسی نظر سے اسے دیکھا جانا چاہیئے۔ ان کی محرومِ اختیارِ ریاست، اس نظرئے کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ فرد کے اختیارِ مطلق کے نظرئے پر انھیں کامل یقین ہے اور اس پردہ

بہت مضبوطی سے قائم ہیں۔

ہو بہو یہی حال قومیت کے عام تصور کا بھی ہے۔ جس طرح فلسفۂ زاج کے نزدیک ہر شخص مختارِ مطلق ہے اور اسے پورا حق حاصل ہے کہ جو اس کے جی میں آئے کرے اور جس چیز کو دل نہ چاہے، نہ کرے، بالکل اسی طرح قومیت کے عام تصور کے مطابق بھی ہر قوم اپنی جگہ پر مختارِ مطلق ہے اور اسے پورا حق حاصل ہے کہ جو اس کے جی میں آئے کرے، اور جو چاہے نہ کرے۔ جس طرح زاج کے ماتحت میرے اوپر جبر کرنا غلط ہے، خواہ جبر کوئی دوسرا شخص کرے یا ریاست اسی طرح قومیت کے عام نظریے کے مطابق میری قوم پر جبر کرنا غلط ہے، خواہ جبر کوئی قوم کرے یا کوئی بین الاقوامی تنظیم۔ سچ پوچھئے تو یہ دونوں نظریے زاجی نظریے ہیں، ایک اشخاص سے بحث کرتا ہے اور دوسرا اقوام سے۔ جس طرح تاریخ نے بنی نوع کو اس بات کا یقین دلایا ہے کہ افراد جو ایک دوسرے سے انسانی رشتوں کے ذریعے وابستہ ہیں، ان کی سچی اور دیرپا آزادی کے لئے قانون کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح آج بھی جب کہ سالمیت دنیا کو روز بروز ایک سماجی کُل کی حیثیت میں منتقل کر رہی ہے، اس چیز کی اشد ضرورت ہے کہ اقوام بھی قانون کی تابع و پابند ہوں۔ اور اگر کمزور کو طاقت ور کے ناجائز حملے سے بچانے کے لئے مشترکہ قوت کی طرف سے طاقت کا استعمال ضروری سمجھا جاتا ہے، تو پھر قوموں کے بارے میں بھی اسی اصول کو کیوں نہ اختیار کیا جائے؟ دنیا اب اس ضرورت کی شدت کو روز بروز محسوس کرتی جا رہی ہے۔ صرف زاجی اس ضرورت سے انکار کر سکتا ہے اور بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ

انکار کر سکتا ہی۔

ہمیں اس بات میں تو اختلاف ہو سکتا ہی کہ اس وحدت پذیر دنیا کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیں راہ کون سی اختیار کرنی چاہیئے مگر چلتے رہنا بہرحال ضروری ہی اس لئے کہ سالمیت کا عمل اس اثنا میں رک نہیں جائیگا بلکہ اسی شدت کے ساتھ جاری رہیگا۔ لہذا ہمارے مدرسوں کو واقعات وحقائق کے متعلق ایک ایسی نظر اور ایسا ادراک پیدا کرنا ہی جس میں ان واقعات سے ان کی اصلی شکل میں نبٹنے کی صلاحیت موجود ہو۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں نظر کی عالمگیریت سے کم کسی اور چیز سے کام نہیں چل سکتا۔ اور اس کا مطلب یہ ہی کہ ہمیں ایک نئی تاریخ، ایک نئے جغرافیے اور شاید ایک نئے سماجی فلسفے کی ضرورت ہی، اس لئے کہ قدیم تاریخ اور قدیم جغرافیہ ہمارے سامنے واقعات کو ان کی اصل شکل میں نہیں پیش کرتے اور ہم اپنے سے قریب آنے والے حالات کو اصلی شکل میں دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ قدیم طریقے نے انسانیت کے حصے بخرے کر دئے اور شاید اسی مقصد کے لئے وہ ایجاد کیا گیا تھا۔ اس نے دنیا کو قومیتوں میں تقسیم کر کے آپس میں نفرت وحقارت کا بیج بو دیا اور یہی اس کا منتہائے نظر تھا۔ مگر اس طرح کے طرز عمل ہمارے بچوں کو اپنے مسائل کا حل سوچنے کے قابل نہیں بنا سکیں گے۔ نئی نسل کے سامنے ایک بالکل نئی دنیا ہی، ایک وحدت پذیر دنیا۔ انھیں صحیح معنی میں صرف سچائی ہی آزادی بخش سکتی ہی۔ اور سچائی ہی پر ہمیں بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

جمہوریت کے مطالبے

جدید تہذیب کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم نے دیکھا تھا کہ اس کی امتیازی خصوصیت جمہوریت بھی ہے۔ یہ تصور اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اس کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ جمہوریت کو کامیاب بنانے کی غرض سے تعلیم حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ جدید تعلیمی نظریے کا دعویٰ ہے کہ ہم وہ باتیں نہیں سیکھتے جنھیں ہم عمل میں نہ لائیں۔ لہٰذا اگر ہم جمہوریت کی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو اسے عمل میں لانا ضروری ہے۔ جمہوریت کی طرف سے ہمیں جو مایوسیاں ہوئی ہیں ان کا ایک سبب، شاید یہ ہے کہ ہم نے کبھی اس کا تجربہ نہیں کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر دنیا کو جمہوری النوع بننا ہے تو لوگوں کو پہلے جمہوریت کی تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ اور یہ کام تعلیم کا ہے خواہ وہ کسی قسم کی ہو، کہیں ہو اور اس کے لئے کوئی بھی راہ نکالے۔ مدرسے کے لئے ایک راہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنے یہاں اس کا تجربہ کرے۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا جب تعلیم کی نوعیت استبدادی تھی۔ ہمارے طالب علم جمہوریت پر عمل پیرا نہیں تھے بلکہ ان کا شعار تعاون و امداد بھی نہیں، جبر و استبداد کی اطاعت تھی۔ جو کچھ انھیں کرنا یا سوچنا ہوتا تھا، وہ نہایت احتیاط کے ساتھ پہلے ہی سے مقرر کر دیا جاتا تھا ان کی محض نگرانی ہوتی تھی۔ ان کی کچھ سنی نہیں جاتی تھی اور اگر انھیں کچھ کہنا ہوتا تھا تو اس وقت تک انتظار کرنا پڑتا تھا جب تک بولنے کی ان کے مستبد استاد کی طرف سے اجازت نہیں مل جاتی تھی۔ ان کی اگر کیسر

نہیں تو خاص ذمے داری استاد کی اطاعت تھی۔ غرض تعلیمی طریقِ عمل کا تعین استبدادی نقطۂ نظر پر مبنی تھا۔ تعلیم ایک ذمہ دارانہ تحقیق و جستجو کا ذریعہ نہیں تھی۔ بلکہ دوسروں سے سن کر اسے چپ چاپ قبول کر لینے کا نام تھا۔ علاوہ ازیں جس چیز کی تعلیم دی جاتی تھی اس کا تعلق بیشتر ایک دور افتادہ مستقبل سے ہوتا تھا۔ گویا بچے کی موجودہ زندگی کا استعمال بہ حیثیت مقصد کے نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک ذریعے کے ہوتا تھا جیسا کہ ایک دوسرے صاحب نے فرمایا ہے "بچپن زندگی کی عمارت کے ایک ضروری جزو کی حیثیت سے نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کی حیثیت زندگی میں داخل ہونے کے لئے ایک دہلیز کی ہوتی تھی یہ ایک دور تھا آئندہ زندگی کی تیاری کا" مختصر یہ کہ روائتی مدارس کا طریقِ عمل جس پہلو سے بھی دیکھئے شروع سے آخر تک غیر جمہوری اصولوں پر مبنی تھا۔

لیکن اس کو کیا کیجیے کہ خود استادوں کے ساتھ استبدادی انداز میں سلوک کیا جاتا ہے جب حالت یہ ہو تو بچوں کے ساتھ اسی طرح پر سلوک ہونا قدرتی بات ہے۔ ہمارے اجتماعی رجحان کی ایک دشواری ان مسائل میں نظر آتی ہے جن سے استادوں اور طالب علموں کے ٹڈی دل کو چار و ناچار مقابل ہونا پڑتا ہے۔ جب ایک بڑے ہجوم کا اہتمام اور بندوبست کرنا ہو تو فرد کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ مدرسے کے نظم و نسق سے متعلق دو رجحانات ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ایک یہ کہ تعلیم کی پالیسی کو کسی مرکزی حاکم کی ذات میں مرکوز کر دیا جائے جو اپنے یہاں سے نصاب اور طریقۂ تعلیم دونوں کے بارے میں

ہدایات دیتا رہے اور ان پر استاد عمل کریں۔ یہ ایک مستبدانہ طریقۂ کار ہے، کارخانے کا نظام جو ایسی جگہ برتا جاتا ہے جہاں اس کی بعض عجیب و غریب طریقے سے مجتمع ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی اس طرح کا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے تو تعلیم، تعلیم نہیں رہتی۔ دوسرا رجحان جو اس کا مقابل ہے، اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ اس اصول کا حامی ہے کہ زیادہ سے زیادہ جہاں تک حالات اجازت دیں، استاد خود اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے، اس کی اور اس کے ساتھ کام کرنے والے دوسرے استادوں کی ذمہ داریاں مشترک ہوں اور ان کا آپس میں تعاون ہو۔ اس طریق عمل پر مبنی کسی دستور العمل کا ہاتھ آنا ذرا مشکل ہے۔ اس کے ظاہری نتائج نسبتاً کم ہوں گے، اس میں انتظامی جانچ پڑتال کی گنجائش بہت کم ہوگی اور ممکن ہے اس پر خرچ بھی نسبتاً زیادہ آئے۔ یہ ایک نئی راہ ہے جس میں دشواریاں ہیں مگر یہ جمہوریت کی راہ ہے۔ اگر ہمارے مدارس کو ایک طرف جمہوریت اور اخلاقیات کے مطالبات پورے کرنے ہیں اور دوسری طرف تعلیمی ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے تو انھیں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا مگر چلنا ہوگا اسی راہ پر۔ اگر دوسرا کوئی رستہ اختیار کیا گیا تو جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، تعلیم تعلیم نہیں رہے گی۔

تعلیم اور ہمارے نت نئے سماجی مسائل

جمہوریت کا ایک اور مطالبہ قابل غور ہے۔ اگر طالب علموں کو صحیح معنی میں شہری بنانا ہے تو لازم ہے کہ عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ، اور ان کی دلچسپیوں اور

نقطۂ نظر کی وسعت کی مناسبت سے انھیں مسائل تہذیب سے زیادہ سے زیادہ قریب رکھا جائے۔ ہمیں بلند فکر مفکرین کا مطالعہ کرکے ان بڑے بڑے سماجی مسائل سے واقفیت حاصل کرنی چاہیئے جو کسی نہ کسی شکل میں نئی نسل کو پیش آنے والے ہیں۔[۱] مانا کہ ان مسائل میں سے بیشتر متنازعہ فیہ ہوں گے لیکن اگر ان پر سمجھ داری سے غور کیا جائے تو ان کی تعلیمی قدر میں کمی کے بجائے اضافہ ہوگا۔ کوشش یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ ان مسائل کے حل کی تعلیم دی جائے بلکہ اس طریق کار کی تعلیم دی جانی چاہیئے جس پر چل کر حل تلاش کیا جا سکتا ہی، خود مسائل کے بارے میں ایک گہری نظر اور ان حقائق کا فہم پیدا کرنے کی ضرورت ہی جن کا ان کے حل سے تعلق ہی۔ ثانوی مدرسہ اور کالج کو اس انداز پر کام کرنے کی زیادہ ضرورت ہی اور اس کی تکمیل کا انھی کی ذات سے امکان بھی ہی۔ اس کام میں مختلف قسم کی رکاوٹیں آئیں گی اور ایسے لوگوں کا سامنا ہوگا جو غیر ارادی طور پر سماجی اور اخلاقی تاخر کو بحال رکھنے کے لئے بے تاب ہو رہی ہوں گے اور اگر ان کا بس چل سکے گا تو مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر اس کام کو ملتوی کر دیں گے[۲] مگر اس مطالبے میں اس قدر واقعیت ہی کہ کسی قسم کی مخالفت کارگر نہیں ہوگی۔ اس

---

[۱] میرے رفیق ڈاکٹر ہیرالڈ۔ او۔ رگ نے اس سلسلے میں بہت اہم کام کیا ہی۔ ملاحظہ ہو "امریکہ کی زندگی اور مدرسے کی تعمیر نو" ہارکورٹ ۱۹۲۶

[۲] مغربی امریکہ کے ایک مقامی اسکول میں سماج کے علم کے متعلق ڈاکٹر رگ کا تیار کیا ہوا نصاب رائج تھا۔ اس پر ایک اخبار کے ایڈیٹر نے اعتراض کیا کہ یہ مروجہ سماجی مسائل کے مطابق نہیں ہی۔ اپنے

لئے کہ خود تہذیب کی جان پر بنی ہوئی ہو۔ وہ کسی مخالفت کی پروا نہیں کریگی۔

حاکمیت کا زوال اور اس کا اقتضاء

سماجی اور اخلاقی دنیا میں حاکمیت کا زوال مدرسے پر ایک دوسری ذمہ داری عاید کرتا ہی۔ اگرچہ اس کتاب کا مقصد مذہب کے بارے میں بحث و مباحثہ کرنا نہیں ہی لیکن پھر بھی چونکہ مذہب کا تعلیم اور اخلاق سے نہایت قریبی رشتہ ہی۔ لہذا اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہی کہ خارجی سند اور جگہوں کی طرح یہاں بھی داخلی سند کے سامنے ماند پڑتی جا رہی ہی۔ آزمودہ خیال کا بے پناہ سیلاب دوسری چیزوں کی طرح اسے بھی اپنے ساتھ بہائے لئے جاتا ہی۔ لہذا اس طبقے کے دانا و بینا حضرات کے لئے یہ ایک بڑا مسئلہ ہی جو مذہب کی خارجی سند کی تنسیخ اور داخلی سند کی ترویج کے درمیان اس لئے قدر کرتے ہیں کہ آنے والے عبوری دور میں اندھیر نہ مچے۔ اور جو اس عقیدے میں اتنا پختہ یقین رکھتے ہیں اور اپنے حل کو اتنے صاف اور واضح

دعوے کی دلیل میں اس نے نصاب کی کتاب کے ایک حصے کا اقتباس پیش کیا تھا۔ اس مدرسے کی ساتویں جماعت کے ایک طالب علم نے اپنے والد سے شکایت کی کہ ایڈیٹر صاحب نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں کتاب کے دوسرے حصوں کو نظر انداز کر دیا ہی جو اگر ان کے اعتراض کا جواب نہ دے سکتے تو کم سے کم اسکی بنیاد ضرور کمزور پڑ جاتی اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ اس لڑکے میں وسعت نظر اور استدلال کی ایسی بنیاد پڑ رہی تھی جس سے ایڈیٹر صاحب محروم تھے۔

ہیں پیش کرتے ہیں کہ کم سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ بغیر کسی تامل کے ان کی پیروی کر سکتے ہیں۔ اس ضرورت کی شدت مذہب[له] پرستوں کی اس بدحواسی اور غم و غصے سے ظاہر ہوتی ہے جس سے مرعوب ہو کر لوگ ان کے عقاید کو تسلیم کر لیا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تبدیلی کے ان دونوں تصورات کی باہمی کش مکش کی وضاحت جتنی اس تحریک سے ہوتی ہے، کسی اور بات سے نہیں ہوتی۔ اگر ایک فریق تبدیلی کا سرے سے منکر ہے تو دوسرا اُسے نمایاں سے نمایاں حیثیت دینے کے لئے تیار۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مناظرے میں مذہب پرستوں کے دلائل اکثر اوقات اپنے حریف مقابل کی بہ نسبت زیادہ منطقیانہ ہوتے ہیں خواہ ان کے عقائد کی حیثیت بالکل پوچ ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ جدید الخیال فریق جیسی کہ اس سے توقع ہے، صداقت کے سامنے جھک تو جاتا ہے مگر اس کے نتائج پر غور کرنے اور انھیں تسلیم کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ بات کی تہ تک جانے سے گھبراتا ہے۔ مگر انسان یا انجیل مقدس کے ارتقار کے اصول تسلیم کر لینا ہی کافی نہیں ہے۔ اسے ارتقار کے نتائج کی روشنی میں دیکھنا اور اس پر غور کرنا چاہیئے۔ غرض یہ آپس کی مخالفت چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور نہایت شدت کے ساتھ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب تک اس جھگڑے کا تصفیہ نہیں ہو جاتا، اس وقت تک ہم اخلاق کی تعلیم کے مسئلے میں کبھی باہمی سمجھوتے پر نہیں پہنچ سکتے۔

له (FUNDAMENTALIST.) امریکہ کے وہ لوگ جو مذہب میں عقائد جدیدہ کے خلاف ان دیرینہ عقائد پر قائم ہیں کہ انجیل کی صحت ناقابل انکار ہے۔

حاکمیت کا زوال مذہب سے زیادہ اخلاقیات میں تیزی پر ہی۔ یہ تحریک اگرچہ بہت زمانے سے جڑ پکڑ رہی تھی، مگر اس کی تیزی اور شدت کا احساس لوگوں کو گذشتہ دس سال سے ہونے لگا ہی۔ اس کا تعلق بظاہر نام نہاد آزادیٔ نسواں سے ہی، کچھ اس لئے کہ نوجوان طبقے کا حصۂ نصف یعنی لڑکیاں براہِ راست اس تحریک میں شریک ہیں اور کچھ اس وجہ سے کہ اس زمانے تک جنسی تعلق حاکمیت کا زبردست مورچہ بنا رہا ہی، ہمیں یہاں اس مسئلے کی حقیقت پر روشنی ڈالنے اور اس کی روایات کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی ضرورت نہیں ہی صرف اتنا کہہ دینا کافی ہی کہ نوجوان طبقہ غلط یا صحیح اس معاملے میں کچھ اس طرح ہمارے قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہی کہ ہم منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ یہ رجحان کچھ ہمارے ملک تک محدود نہیں ہی، بلکہ مختلف ناموں سے کہیں کم کہیں زیادہ، یہ تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہی۔ ان سب میں قدرِ مشترک بہرحال یہ ہی کہ نوجوان اپنے مسائل کو بہت بڑی حد تک اپنے آپ حل کرنے کی فکر میں ہی۔ وہ اپنے بڑوں کے تادیبی فقروں پر اب بہت کم کان دھرتا ہی۔ اور موجودہ رسم و رواج اس کے نزدیک اب ایسے نہیں رہ گئے ہیں کہ ان کو تسلیم کیا جائے۔ اب وہ ہر چیز کی کنہ پر زور دیتا ہی اس لئے کہ اس کے نزدیک ایقان وایمان کا یہی معیار ہی۔ مگر جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، اس رجحان کے نتائج لوگوں کے عام اندیشوں کے باوجود ضروری نہیں کہ کلیتاً بُرے نکلیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس سے اخلاق کا ارتقا ہو؟ اگر تخلیقی فکر علوم طبعی کی تکمیل کر سکتا ہی تو اخلاق کی تکمیل نہیں کر سکتا؟ یہ جو ہم سمجھنے لگے ہیں کہ ہماری اجتماعی زندگی کے آداب میں کوئی ارتقا

نہیں ہوسکتا اس کی وجہ کہیں جائز و ناجائز ٹھہرانے والے وہ قوانین تو نہیں جن کے ذریعے ہمارے اجداد نے ہمارے اخلاقی اعمال پر پردہ ڈال دیا تھا؟ یہ دلیل کہ ہم آگے بڑھنے کے لئے اپنی راہِ عمل کا قبل از وقت تعین نہیں کرسکتے کوئی معقول دلیل نہیں ——— اب ہم پہلے کی طرح آئندہ زندگی کے دھرّے کا اندازہ نہیں لگا سکتے ۔ تو جب ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے تو اول الذکر سے انکار کیوں کیا جائے ؟

مگر یہ سوال رہا جاتا ہے کہ مدرسے پر کیا ذمے داری عائد ہوتی ہے؟ اس سوال کا جواب ظاہر ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنے مسائل کو خود حل کرنے میں نوجوانوں کی مدد کریں ۔ اگر وہ چیزوں کی علت جاننا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی تلاش میں ان کا ساتھ دیں۔ رہی یہ بات کہ کچھ لوگ علت کی تلاش میں خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ ممکن ہے، وہ نہ ملے تو اگر علت اس قدر حقیر اور غیر واضح ہے کہ تلاش کرنے سے اس کا پتہ نہ چلے تو اسے نظر انداز کر دینے میں بھی کوئی نقصان نہیں ہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ " نوجوانوں کا مزاج بہت تیز ہوتا ہے اور ان کے خون میں جوش، ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ چیز انھیں اس تلخ علت کی تحقیق پر آمادہ کرنے کے بجائے جوان کے نفس پر شاید قابو رکھ سکے، ان کے لئے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا ایک بہانہ بن جائے گی ؟" میرے خیال میں وہ اپنے اس اندیشے میں حق بجانب ہیں، لیکن جیسا کہ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے، اس کی حیثیت محض ایک شرط کی ہے، نظریے کی نہیں جس سے ہمیں دوچار ہونا ہے۔ مدرسے کو چاہیئے کہ وہ حقائق کو ان کی اصلی شکل میں دیکھے اور سمجھے ۔ جب سوال جواب

کرنے کا رجحان دنیا میں اس قدر پھیل چکا ہے تو ایک تیز طبع نوجوان سے یہ امید رکھنا کہ وہ چپکا بیٹھا رہے گا، صحیح نہیں ہے۔ اور یہی وہ ذمہ داری ہے جو ہمارے اوپر عائد ہوتی ہے۔ اخلاق میں ایک نئی فضا پیدا ہوگئی ہے۔ پرانا نقشہ مٹ چکا ہے اور اب اس حقیقت کے مناسب حال نہیں رہا جو تبدیلی کی تیز روی نے پیدا کردی ہے۔ اب ہمیں ایک نئے ضابطۂ عمل کی تلاش کرنی ہے جو ہم میں مستقبل کی غیر معین اور لمحہ بہ لمحہ بدلنے والی ماہیت سے مقابل ہونے کا بوتا پیدا کر سکے۔ خارجی سند کا زمانہ جا چکا اور ہمیں اس حقیقی سند کی تلاش میں اپنے نوجوانوں کی مدد کرنی ہوگی جس پر سب کا اعتماد ہو —— تجربہ اور عمل کی داخلی سند۔ یہ طرز عمل تبدیلی کے سیلاب میں ثابت قدم رہنے کا ایک ذریعہ بھی ثابت ہوگا۔ اگرچہ یہ پیرایۂ عمل بہت مشکل ہے، مگر اس کا مطالعہ اور حصول ناممکن نہیں۔ آثار بھی ہمارے موافق ہیں۔ ہمارے نوجوان دیانت دار اور مستعد ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے حقائق کی علت معلوم کرنے میں ہم ان کی امداد کریں اور جب وہ اسے معلوم کرلیں تو اسے سیکھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے ان کو آمادہ کریں۔ اخلاق کے میدان میں حاکمیت دم توڑ رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ایک دوسرا اور اس سے بہتر اصولِ اخلاق اس کی جگہ لے۔

تبدیلی کی حقیقت اور اس کا مطالبہ

ہمارے مشاہدے کا ایک بڑا اہم نتیجہ یہ تھا کہ دنیا نہایت تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے۔ یہ تصوّر سامنے آتے ہی ہماری بحث پر کچھ اس طرح چھا گیا ہے کہ

اس پر مزید غور و فکر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ گذشتہ زمانے میں تبدیلی کے متعلق یہ مسئلہ کہ اسے ہمیں اپنے معینہ مطمح نظر میں کسی حد تک دخیل ہونے کی اجازت دینی چاہیئے، کچھ بہت زیادہ شدید نہیں تھا۔ اس لئے کہ بہت زمانے تک بیشتر منکرین تبدیلی کو انسانی معاملات میں کوئی اہم جگہ نہیں دیتے تھے۔ وہی مسئلہ جو ایک زمانے میں بیشتر ایک علمی نکتے کی حیثیت رکھتا تھا، اس صنعتی دور میں اہم ہوگیا ہے۔ تبدیلی کی رفتار اب اس قدر تیز ہوگئی ہے کہ اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پرانا نظریہ موجودہ تصور کی شدت میں محض اضافہ کرتا ہے۔ ارسطو کی تصوریت اب کافی نہیں رہی ہے۔ ہمیں اپنی دنیا کے مسائل و معاملات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ڈاروِن کی طرح اس کی مسلسل اور ہمہ گیر تبدیلیوں کو آگے پیچھے سے نہایت غور سے دیکھیں۔ تا آنکہ انھیں محدود ثابت نہ کر دیا جائے۔ بقول جیمس، ہماری دنیا اب ایک عقدۂ سربستہ نہیں رہی، اب اس کی مہر ٹوٹ چکی ہے۔ ہم ایک نامعلوم مستقبل سے مقابل ہیں وہ اتنا متعین نہیں ہے کہ ہم اپنی منزل کا پہلے سے تعین کر سکیں خواستہ یا ناخواستہ، ہمارے لئے تبدیلی کے ایک ایسے فلسفے کے علاوہ اور کوئی دوسرا حل نہیں ہے۔ جو ہماری دنیا کے گوناگوں مسائل کو سمجھنے میں مشعل راہ کا کام دے۔ انسان کی عقل و خرد کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی تصوری دنیا کو اپنی ایجادات و اختراعات کے دوش بدوش لائے۔ منطق، اخلاق، مذہب، فلسفہ، سب کو ایک نیا چولا بدلنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ موجودہ حال سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ ورنہ انھیں ہماری ضروریات کی تکمیل میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

تعلیم کے سامنے بھی اسی طرح کی تعمیر نو کا مسئلہ درپیش ہے۔ اب تک اس

کا طرزِ عمل ایسا رہا ہے گویا اس کے سامنے ایک متعینہ نظامِ حیات تھا۔ ماضی قریب تک یہ اپنے آپ کو ایک مقررہ مستقبل کے لئے ایک مخصوص قسم کی تیاری کا ذریعہ تصور کرتی رہی ہے۔ اس کا نفس مضمون مشتمل تھا مسائل کے ان قدیم اور بیشتر اوقات روایتی حلوں پر جن کی ہمیشہ تکرار ہوتی رہتی تھی اور آئندہ بھی ہوتی رہنی چاہیئے تھی۔ اس کا نصاب اسی قسم کے مضامین کا ایک منظم و منضبط مجموعہ تھا سیکھنا عبارت تھا ان باتوں کو قبول کر لینے سے جو اس نصاب کے ماتحت بتادی جاتی تھیں۔ مطالعہ مسخ ہو کر نام رہ گیا تھا مضمونوں کو اس طرح پر رٹ لینے کا کہ استاد کو ان کے رٹ لئے جانے کا یقین ہو جائے۔ خود لفظ فرماں برداری کا مفہوم اس طریقۂ تعلیم کی مناسبت سے یہ ہو گیا تھا کہ طالب علم اپنے مطلق العنان بزرگ کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات پر ایمان لائے۔ مگر اس ایمان کی حقیقت کیا تھی۔ زندگی سے عاری اور اس قدر لوچ کہ اسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔ تعلیم کی یہ تصور قدیم فلسفے کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ انسان ایک حال پر شاذ و نادر ہی قائم رہتا ہے۔ اور زمانہ گذشتہ میں وقت کے منطقی مسلمات سے اکثر و بیشتر گریز کی گئی ہے تاکہ نظامِ حیات کے بدلتے ہوئے رجحانات سے مطابقت پیدا ہو سکے۔ مگر بایں ہمہ قدیم فلسفے کا تسمہ اب بھی باقی ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم واقعات و حقائق کو سمجھیں اور ان سے جو نتائج رونما ہوئے ہیں، ان کی روشنی میں اپنے معاملات پر غور کریں۔

غرض تعلیم کو آنکھیں کھول کر اپنے نامعلوم مستقبل سے عہدہ برآ ہونا ہے ہمارے سامنے جو صورتِ حال ہے، وہ اگرچہ بدلنے والی ہے، مگر پھر بھی لوچدار

ہے اور ایک حد تک ہمارے اپنے قبضے میں ہے۔ وہ حقائق جو ہمارے لیے رہنما ثابت ہو سکتے ہیں، انھیں اسی قسم کے الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے مثلاً تبدیلی۔ تبدیلی کی روز افزوں تیز رفتاری۔ نامعلوم مستقبل، غور و فکر۔ صورتِ حال ایک حد تک قابو میں ہے۔ تجربی طریقِ عمل۔ فکر و خیال کا نتائج کی روشنی میں تجربہ، تجربے کی کسوٹی پر پرکھا ہوا طریقِ کار وعلیٰ ہذا۔ تمدنی ترقی کے سلسلے میں جب ہم غور کرنے لگیں تو ہماری نظر سماجی اور اخلاقی مطمحِ نظر پر ہنی چاہیئے اور اس بات پر کہ ہم میں کہاں تک قوتِ جاذبہ ہے تاکہ ہم ان اقدار کو اپنی تہذیب کے حرکت پذیر "مادی" پہلوؤں کے دوش بدوش لا سکیں اور ان کو اسی حالت میں قائم رکھ سکیں۔

اس تمام بحث و نظر کا مطلب دوسرے الفاظ میں مدرسے کے مقصد و منہاج کی تنظیم نو ہے۔ نصاب اور طریقۂ تعلیم دونوں کی بنیاد پرانے زمانے کی طرح جامد اصولوں پر ہونے کے بجائے متحرک اصولوں پر ہونی چاہیئے۔ خاندان اور قبیلے کی تعلیمی حیثیت کے ختم ہو جانے کی وجہ سے اور لکھانے پڑھانے کے طریقوں میں اس سے بہتر نظر پیدا ہو جانے کا اقتضا یہ ہے کہ مدرسہ ایک ایسا مقام ہو جہاں زندگی حقیقی تجربے کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یہی اور صرف یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہمارے بچے وہ کچھ سیکھ سکتے ہیں جس کی انھیں ضرورت ہے۔ یہ حالات مدرسے کو اپنے ساز و سامان، کتبِ درس، انتظام و انصرام، اور مقصد و منہاج میں مناسب تبدیلی کرنے پر مجبور کریں گے۔ ہماری نئی جد و جہد کا رُخ خاص طور پر ہمارے طرزِ عمل، نقطۂ نظر اور طریقِ کار کی طرف ہونا چاہیئے۔

مگر ان سب کا نتیجہ کیا ہونا چاہیئے؟ اس سوال کا جواب غور کیجئے تو بہت پہلے دیا جا چکا ہے۔ ایک طرف تو یہ کہ ہمارے نوجوانوں میں ایک ایسا حرکت پذیر ذہن، ایک ایسی نظر، ایسی عادات اور ایسے اطوار کی تعمیر ہو جو انھیں تبدیلی کے اس طوفان میں اپنے رستے پر چلتے رہنے کے قابل بنا سکیں۔ اس کام کے لیئے ضرورت ہے کہ انھیں اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کی طاقت اور اپنے معاملات میں احتیاط اور دانشمندی کے ساتھ خود بخود فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو اور عمر کے ساتھ ساتھ اس میں بھی اضافہ ہوتا رہے۔ اور ہمیں کہ ان کے بڑے ہیں، چاہیئے کہ اپنے ان تمام حقوقِ اقتدار سے دستکش ہو جائیں جو ہمیں ان پر حاصل ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ ایک نسل دوسری نسل کو اپنے حلوں کا پابند کر سکے۔ دوسری جانب ہمارے نوجوانوں کو خود ایسے عام اور لوچدار فن سیکھنے کی ضرورت ہے جو ان کے نامعلوم مستقبل میں زیادہ سے زیادہ ان کے کام آ سکیں۔ ہم ان کے مسائل ہی کو اچھی طرح سے سمجھنے سے قاصر ہیں، ان مسائل کا حل سوچنا تو دور کی بات ہے۔ مگر ہم ان کے سامنے ان کے مسائل کا ایک دھندلا سا خاکہ ضرور پیش کر سکتے ہیں اور ایک حد تک یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ ہوا کا رُخ بظاہر کس طرف ہے۔ ہم انھیں اپنے مفید ترین ذخیرۂ معلومات تک پہنچنے کا نہایت کامیاب راستہ بتا سکتے ہیں۔ اور اتنا تو ضرور کر سکتے ہیں کہ حقیقتِ اشیاء کو سمجھنے کے لیئے ہم نے بہتر سی بہتر جو اصول مقرر کر رکھے ہیں ——— جن میں دوسرے اصولوں پر تنقید و تبصرے کے اصول بھی شامل ہیں، ——— ان پر انھیں

کامل عبور حاصل ہو جائے۔ یہ سب اس لئے کہ ہماری نوخیز نسل اس نامعلوم اور انتقال پذیر مستقبل سے جو ہمارے مقابل ہے، عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمارے مقدور بھر زیادہ سے زیادہ تیار ہو سکے۔

یہ ہیں وہ مطالبات جنھیں ہماری تیزی سے بدلتی ہوئی تہذیب تعلیم کے سامنے پیش کرتی ہے۔

باب سوم

باب سوم

نئی تعلیم

تعلیم میں تبدیلی رونما ہو چکی ہے

ہمارے مدرسوں میں تبدیلی بہت پہلے سے آ چکی ہے۔ ہر وہ شخص جوانی عمر کا نصف حصہ طے کر چکا ہے، دیکھتا ہے کہ اب کے مدرسے اس زمانے کی بہ نسبت جب وہ بچہ تھا کس قدر مختلف ہیں۔ ہر سرپرست اور خاص طور پر وہ لوگ جن کے بچے خوش قسمتی سے زمانۂ حاضرہ کے بہترین مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں، اس تبدیلی کو محسوس کرتے ہیں۔ اس تبدیلی اور ان مدرسوں کے متعلق ان کی قریب قریب ہر نشست میں تبادلۂ خیال ہوتا رہتا ہے۔

"بچے آج کل اپنے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔"

"وہ دلچسپی اس لئے لیتے ہیں کہ کام کام نہیں ہوتا، کھیل ہوتا ہے۔"
"آپ اسے کھیل کہتے ہیں مگر میں کام کہتا ہوں۔ وہ پہلے کی بہ نسبت کام بھی زیادہ کرتے ہیں، اور سیکھتے بھی زیادہ ہیں، ہاں اس میں شک نہیں کہ وہ خود اسے کام نہیں کہتے۔"
"مگر نظم وضبط! ذرا اسے بھی تو ملاحظہ فرمائیے۔ لڑکے اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں اور آپس میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ جب ہم پڑھتے تھے تو جس طرح ہم سے کہا جاتا تھا، بے حس و حرکت بیٹھے رہتے تھے۔"
"بجا ارشاد ہوا۔ مگر پہلے کی بہ نسبت اب نظم وضبط بھی زیادہ ہے۔ میں نے جا کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"
نئے مدرسے پر اس طرح تبصرے ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اصلیت کیا ہے؟ مدرسے کس طرح بدل گئے؟ اور کیوں؟ ان کا ان معاشرتی تبدیلیوں اور ان کے مطالبات سے تعلق کیا ہے جن پر ہم اب تک بحث کرتے آئے ہیں؟ آئندہ مستقبل کا کیا ہوگا؟

ظاہر ہے کہ اس زمانے کا مدرسہ پہلے سے بالکل مختلف ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد پرانے دماغوں پر جو فوری اثر پڑتا ہے وہ کچھ خوشگوار نہیں ہوتا۔ مدرسے میں جدھر دیکھئے، نہ اتنی جماعتی باقاعدگی ہے۔ نہ سیدھی قطاریں چلنے کا اتنا چلن۔ بچے الگ الگ چلتے پھرتے ہوں گے۔ بیٹھنے کے لئے بنچوں کے بجائے شاید متحرک کرسیاں نظر آئیں اور وہ بھی سیدھی قطاروں میں نہیں۔ یہاں بچوں کی ایک ٹولی آپس میں کسی موضوع پر گفتگو کر رہی ہے، تو وہاں استاد سے کسی مسئلے پر

تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ دوسری طرف ایک ٹولی کتب خانے جا رہی ہے۔ جب ہم بچے تھے تو ابتدائی مدرسوں میں اوّل تو کتب خانے ہوتے ہی نہیں تھے اور ہوتے بھی تھے تو برائے نام۔ تعلیم میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب بیشتر مدارس میں کتب خانے مختلف مطالعوں کے مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کی تبدیلیاں آج کل نہایت نمایاں نظر آتی ہیں۔

اب رہا نظم وضبط کا سوال۔ اس ذیل میں اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو نسبتاً زیادہ صحیح نتیجے پر پہنچیں گے۔ بوسٹن نے ۱۸۴۵ء میں ایک سرکاری مدرسے کا جس میں ۴۰۰ طالب علم تھے، جائزہ لیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہاں روزانہ ۶۵ بیتوں کا اوسط ہے یعنی ہر چھ منٹ کے بعد ایک بینت اسی سال ماساچوشیٹ MESACHUSETTS میں سینکڑوں قصباتی مدرسے اس سبب سے بند کر دئے گئے تھے کہ طالب علموں نے اپنے استادوں کو مدرسوں سے مار بھگایا تھا۔ اس زمانے میں ماساچوشیٹ اس لحاظ سے ملک بھر میں شاید سب سے زیادہ بدنام تھا۔ وہ دن تھا اور آج کا دن، مدرسوں میں بینت کی سزا اور طالب علموں کی بغاوتیں، دونوں سرے سے ختم ہو گئی ہیں۔ استاد اور شاگرد کے درمیان اس فطری مخالفت کے بجائے ایک بالکل مختلف روح پیدا ہو رہی ہے۔ ایک محسوس اشتراک عمل کی روح جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ تشدد کا رواج روز بروز کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور طلبار کے عادات واطوار؟ آپ ذرا کسی اچھے ہائی اسکول میں تشریف لے جائیے اور مثال کے طور پر دیکھئے کہ کس طرح طالب علموں کی کمیٹیاں اپنے مدرسے کے کمروں اور برآمدوں

میں "چلنے پھرنے" کا انتظام کرتی پھرتی ہیں۔ آپ کو اس ذیل میں کوئی اہتمام والتزام نہیں نظر آئے گا۔ ہر طالب علم نہایت خاموشی اور باقاعدگی کے ساتھ خود بخود ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چلا جاتا ہے۔ نگرانِ مدرسہ سے دریافت کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نظم وضبط میں بہت کم خلل پڑتا ہے اور کبھی کوئی گڑبڑی ہو بھی جاتی ہے تو وہ بہت معمولی اور قابلِ درگذر ہوتی ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ تقصیر و گناہ کے عناصر ختم ہو چکے ہیں اور آسمان کی بادشاہت قائم ہو گئی ہے ——— اور نہ اس کا کوئی دعویٰ ہی کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نوجوانوں سے بعض اوقات ذاتی طور پر لغزشیں سرزد ہوتی ہیں جن سے سخت تکلیف ہوتی ہے، مگر نظم وضبط کا وہ مفہوم جو قدیم مدرسے میں رائج تھا، بہت بڑی حد تک قصۂ ماضی بن چکا ہے۔

آپ جتنا ہی زیادہ ان تبدیلیوں کا مطالعہ فرمائیں گے، یہ بات آپ پر اسی قدر روشن ہوتی جائے گی کہ یہ تبدیلیاں ان سماجی تحریکات کا جزو لاینفک ہیں جن کا ہم اب تک مطالعہ کر رہے تھے۔ مدرسے پر سماج کی عاید کی ہوئی ذمے داریاں اور مدرسے پر ان کا ردِ عمل پچاس ساٹھ سال سے برابر کارفرما ہے۔ اور پچھلے بیس سال سے تو اور بھی زیادہ۔ مدرسہ اپنی نئی ذمے داریوں کو پورا کرنے کے لئے کسی قدر آگے قدم بڑھا چکا ہے۔ جیسا کہ اندیشہ تھا، اس کام میں کچھ بے ڈھنگا پن نظر آتا ہے، اس لئے کہ مدرسہ اس مسئلے کو ابھی بخوبی نہیں سمجھ سکا ہے۔ اور محض "عمل آزمائش" کے ذریعے نئی صورتِ حال کے دوش بدوش چلنے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ مطالبہ شدت اختیار کر رہا ہے کہ ہم نہایت ہوشیاری کے ساتھ

اپنے کام اور اس کی علت غائی پر نظر رکھیں۔ یہ کتاب بھی اسی مطالبے کے رد عمل کی مختلف شکلوں میں سے ایک شکل ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ اس مطالبے اور اسے پورا کرنے کے لئے جو کوششیں جاری ہیں، ان کی طرف آپ کے بیدار ذہن کو پہلے سے زیادہ مبذول کیا جائے۔

طریق عمل تو اس سے پہلے بھی کہ ہمیں اس کا علم اور احساس ہو، کوئی نہ کوئی کارفرما رہتا ہے اور اس سے نتیجے بھی برآمد ہوتے ہیں۔ یہ قاعدہ قدرت ہے۔ مگر کسی طریق عمل کے اساسی اجزائے ترکیبی کے باقاعدہ مطالعے کا نتیجہ تعلیم ہی میں نہیں، علم کے ہر میدان میں یہ ہونا چاہیئے کہ اُس کا رُخ پہلے سے صحیح سمت کو پھیرا جائے اور اس سے نسبتاً بہتر مقصد حاصل ہو۔ اس باب میں اب تک ہم نے جو کچھ کہا ہے، اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ "مادی ترقی" ایک حقیقت ہے، نہایت واضح اور صاف۔ سماج اور اخلاق کی پسماندگی بھی اسی طرح ظاہر ہے۔ مدرسے کو صورتِ حال کا احساس ہی نہیں ہے بلکہ وہ عملی طور پر اس کے مقابلے کے لیے چل بھی پڑا ہے۔ رفتار زمانہ کی علت غائی کو سمجھنے کے لئے جو جذبہ پیدا ہوا ہے، آیئے ہم اس کو اور زیادہ بیدار کر دیں۔ اس طرح مدعا منزل زیادہ واضح نظر آئے گی اور وہاں تک پہنچنے کے بہتر ذرائع سوچے جا سکیں گے۔ اور تب ہم ایک اچھی اور کامیاب زندگی کی امید کر سکیں گے۔

اصل مسئلہ

ہم نے اپنی بدلتی ہوئی تہذیب کی ماہیت دیکھی اور اس تہذیب نے تعلیم

پر جو چند نہایت اہم ذمے داریاں عاید کی ہیں، ان کا مطالعہ بھی کیا۔ اس مسئلے پر کہ ان ذمے داریوں کو پورا کرنے کے لئے کس قسم کے مدارس کی ضرورت ہی، ممکن ہی اتنی آسانی سے اتفاق نہ ہو سکے جتنی آسانی سے اوّل الذکر دو باتوں پر ہو سکتا ہی۔ اب تک کی گفتگو کی نوعیت ذاتی تعبیر و تفسیر کے بجائے نسبتاً موضوعی رہی ہی۔ اور ہر صاحبِ نظر کو دعوت دی جاسکتی تھی کہ وہ خود حالات کا مشاہدہ کرے اور ان سے نتائج اخذ کرے۔ مگر یہاں سے اس کا انداز بدلتا ہی اور جو صاحبان ہماری بحث و نظر کی ماہیت سے ناواقف ہیں، اُن کو نہایت صفائی کے ساتھ عرض کر دینا مناسب ہی کہ اب ہم اس منزل میں داخل ہو رہے ہیں جہاں قدم قدم پر اختلاف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اب جو خاکہ پیش کیا جانے والا ہی وہ راقم الحروف کے نزدیک زیرِ بحث مسئلے کا بہترین حل ہی۔ بہتر معلوم ہوتا ہی کہ ایک یک طرفہ پروگرام اور خاکہ پیش کر دیا جائے خواہ اسے سردست قبولِ عام کا درجہ حاصل نہ ہو سکے۔ ہو سکتا ہی کہ یہ پروگرام اس قدر آگے بڑھا ہوا ہو کہ جمہور کے دماغ کی پسماندگی اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ اور یہ بھی ممکن ہی کہ اس کے پیچھے جو فلسفہ ہی، وہ ابھی بالکل نیا ہو۔ اس پروگرام کے علاوہ دوسرے اور بہت سے امکانات ہوں گے جو یقیناً صحیح اور مبالغے سے پاک ہوں گے۔ مقصود بہرحال یہ ہی کہ ایک ایسا خاکہ اور طریقۂ کار پیش کیا جائے جو مذکورہ بالا مطالبات کو پورا کرنے کے لائق ہو۔

اگرچہ ہمیں اس جدید تہذیب کی ماہیت اور مادّی ترقیات کے مقابلے میں اس کی سماجی و اخلاقی پسماندگی پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم

ان مختلف النوع مطالبات کو جنھیں اس نئی تہذیب نے تعلیم پر عاید کیا ہے، مرتب شکل میں رکھنا بہتر ہوگا۔ اس چیز پر زور دینا اس لئے منظور ہے کہ اس کے بعد ہمیں اپنے مدرسے کے پروگرام کے صحیح خد و خال زیادہ آسانی سے نظر آسکیں گے۔

یہ نمایاں مطالبات جو ایک نئی تعلیم کے متقاضی ہیں، مندرجہ ذیل تین باتوں کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ "مادّی" ترقی کے مقابلے میں ذہنی و اخلاقی پسماندگی۔ مستبدانہ اصولِ اخلاق کا زوال اور مستقبل کی غیر متیقن اور انتقال پذیر ماہیت۔ اور ان تینوں کے ساتھ ساتھ جمہوری رجحان میں اور "عظیم المرتبت صنعت" کی بدولت سماج میں جو تبدیلیاں آگئی ہیں، ان میں مناسب اور مطلوبہ رد و بدل کے امکانات کی کمی۔ اگرچہ اس بات پر ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لینے کی حد قائم ہو جانے کا اندیشہ ہے، تاہم ان مطلوبہ تبدیلیوں کی حیثیت چونکہ رہبرانہ ہے، لہذا آیئے ہم انھیں تین الگ الگ عنوانات میں تقسیم کرلیں نمبر ایک، اخلاق کی ایک عالمانہ تشکیلِ نو جس میں اشیاء و اقدار کو "کیا" اور "کیوں" کے ذریعے سمجھ کر تسلیم کرنے کی اجازت ہو، نمبر ۲ جو سماجی مسائل اب تک حل نہیں ہو سکے ہیں، انھیں حل کرنے کے اصول و قواعد۔ اور نمبر ۳ سماجی معاملات اور طرزِ عمل میں وسیع نظری اور ایک مضبوط اخلاقی سیرت۔ اثنائے فکر میں جب تک ہم ان دونوں کو ——— یعنی مطالبہ اور صورت حال کو ——— پہلو بہ پہلو نہ رکھیں گے تاکہ ایک دوسرے پر روشنی ڈال رہا ہو اور اس کے مفہوم کی تکمیل کر رہا ہو، ہم نئی تعلیم کو کیا بہ اعتبار مقصد یا کیا بہ اعتبار منہاج صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

مدرسہ اور پرانا تجربہ

قدیم روائتی مدرسہ اپنے ابتدائی تصور کے مطابق بالعموم اس موروثی تعلیم کے محض تتمے کی حیثیت رکھتا تھا جس میں ہر بات واقعی تجربے کے ذریعے سیکھی جاتی تھی۔ اس نے بہ حیثیت مجموعی جماعتی تجربات کے ان چند نتائج کی تعلیم دی ہی جو اس قدر پیچیدہ ہوتے تھے کہ زندگی کے عام تجربات کے ذریعے نہیں سیکھے جا سکتے تھے۔ اس میں لکھنا، پڑھنا، اور حساب (جو مدرسے کے علوم وفنون سمجھے جاتے تھے اور جن کی تعلیم کا ایک خاص انداز تھا) اور چند دوسری معلومات شامل تھیں، جن کی ایک تعلیم یافتہ شخص سے توقع کی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ قدیم علم النفس کے مطابق مدرسے کا دھیان وقت بچانے کی طرف رہا ہی اور اس کی کوشش یہ رہی ہی کہ دوسروں کے سوچ بچار کے بنے تلے اور بالکل تیار نتائج بچوں کے سامنے رکھ دے اور انھیں خوب یاد کرا دے۔ اس کام کا انحصار تمام تر نصاب کی کتابوں پر ہوتا ہی۔ ایک صدی پہلے چیزوں کو از بر کرا دینا تعلیم کا قاعدہ کلیہ تھا البتہ اس عہد کے مصلحین اتنا ضرور کہتے تھے کہ بچے جو کچھ سیکھتے ہیں وہ ان کی سمجھ میں بھی آنا چاہیئے۔ ظاہر ہی کہ کسی مسئلے کو محض از بر کر لینا نہ اس بات کی ضمانت تھی کہ وہ بچے کے ذہن میں محفوظ رہے گا اور نہ اس بات کی کہ وہ اس کا صحیح استعمال کر سکے گا۔ اسی زمانے میں چند اور نظری مصلحین نے یہ کہنا شروع کیا کہ سیکھنے کے عمل میں بچے کے حواس کو بھی دخل ہونا چاہیئے۔ اعتراض اس بات پر نہیں تھا کہ بچے میں اصول و قواعد کے حصول کے ذریعے

اتنی صلاحیت پیدا ہو جانی چاہیے کہ اسے مطلوبہ نسلی کارناموں پر عبور ہو جائے سوال صرف یہ تھا کہ یہ ہو کس طرح؟ اس کے بعد کے مصلحین نے اس بات پر زور دیا کہ بچوں میں اتنی صلاحیت پیدا ہونی چاہیے کہ وہ جو باتیں سیکھتے ہیں انھیں اپنی زبان میں خوبی کے ساتھ بیان کر سکیں۔ آج اس قدر کوششوں کے بعد بھی یہی دقت درپیش ہے۔ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ بچے میں اپنے آبا و اجداد کے تجربات کے نتائج سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے مگر یہ چیز کہ یہ بات پیدا کس طرح ہو، اب تک ایک معمہ ہے، دوسروں کے سوچے سمجھے اور طے کیے ہوئے اصول و قواعد کا محض جان لینا کافی نہیں ہے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟

مدرسہ اور نیا تجربہ

اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ دو نئی تبدیلیاں آکر مسئلے کی نوعیت کو بدل دیتی ہیں اور شاید اس کے آخری اور قطعی حل کا پتہ بھی دیتی ہیں۔ پہلی چیز ایک نیا اور بھرو سے کا علم النفس ہے اور دوسرے خاندانی اور جماعتی زندگی کی وہ تبدیلیاں ہیں جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں یکساں طور پر اس بات کی متقاضی ہیں کہ مدرسہ ایک ایسا مقام ہونا چاہیے جہاں سچ مچ کا تجربہ ہوتا ہو۔ مدرسے کو تعلیم کا وہی پرانا فطری انداز اختیار کرنا چاہیے جو عہد قدیم میں قبیلوں میں رائج تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مدرسہ واقعی ایک تجربہ گاہ ہو۔ اس لیے کہ صرف اسی قسم کے تجربے کی فضا میں بچہ وہ تعلیم حاصل کر سکتا ہے جو

فطرت اور زندگی سے قریب ہو۔ اور جو پہلے خاندان اور جماعت میں دی جاتی تھی۔ فطری تعلیم کا خاصہ زندگی تھی اور چونکہ وہی زندگی تعلیم سے فنا ہوگئی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس کا پھر سے احیا کیا جائے۔ حقیقی تجربے کی ضرورت چونکہ خاندانی زندگی کے زوال کا نتیجہ ہے لہذا نفسیاتِ تعلیم کی جدید تحقیقات کی طرف سے اس کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔ اس موخرالذکر چیز یعنی نفسیات تعلیم کی اس قدر اہمیت ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے یہاں اس پر بھی کماحقہٗ غور کر لینا نہایت ضروری ہے۔

سیکھنے کے لئے تجربہ شرط ہے

کوئی بات سیکھی کس طرح جاتی ہے؟ اس باب میں متعدد اصول و قواعد وضع کیے جا سکتے ہیں اور بہ اعتبار صحت و جواز نہایت وثوق و یقین کے ساتھ مگر سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ "سیکھنے" سے مراد کیا ہے؟ ہم کسی چیز کے متعلق کس وقت کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمیں آگئی۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ عمل (CONDUCT) کارآمد اور مفید تعلیم کی کنجی ہے۔ سیکھنے کے معنی ہیں کسی عمل پر عبور حاصل کرنا۔ کسی چیز کے متعلق ہم اس وقت کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمیں آگئی جب موزوں وقت آنے پر اُسی قسم کے عمل کے واقع ہونے کا نہ صرف امکان ہو بلکہ یقین ہو۔ کسی سیکھی ہوئی چیز کی ایک خاصیت ہوتی ہے کہ جب مناسب وقت آجاتا ہے تو وہ چیز خود بخود ہی سامنے آجاتی ہے اور اُسے مخالف طاقت روک نہیں سکتی۔ ——————— "سیکھنے" کا یہ مفہوم قرار

دینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ اس قسم کا سیکھنا ہوتا کیوں کر ہی؟ پہلی چیز یہ ہی کہ جو کچھ ہم سیکھیں اسے عمل میں لائیں۔ دوسرے ہم وہ باتیں سیکھتے ہیں جو ہم سے جوابی فعل کے طور پر خود بخود سرزد ہوتی ہیں۔ تیسرے ہر چیز کی ٹھیک ٹھیک مشق ضروری ہی۔ ان تینوں بیانات میں جن میں باہم محض الفاظ کا اختلاف ہی، جس طرح واقفیت اور مہارت شامل ہیں بالکل اسی طرح داخلی طرزِ عمل اور حسن ظن بھی انھی کے ماتحت آتے ہیں۔ مگر پھر بہت سے مفید اوصاف ایسے بھی ہیں —— مثلاً لطف و کرم کا وصف —— جن کی باضابطہ طور پر مشق نہیں ہو سکتی۔ ایک استاد کے لئے یہ ناممکن سی بات ہی کہ وہ کسی طاقتور بچے کو جو کمزور بچوں کو ستاتا رہتا ہی، مدرسے کے بعد روزانہ نصف گھنٹہ بٹھلائے اور اس سے نہایت خاموشی اور اطمینان کے ساتھ ہمدردی کے وصف کی مشق کرائے۔ ہمدردی کا وصف اس طرح نہیں پیدا ہوتا۔ ہمدردی کے وصف کی مشق محض اجتماعی مواقع پر ممکن ہی اور وہ بھی اس وقت جب کسی بات پر اسے کام میں لانے کی واقعتاً ضرورت پیدا ہو۔ ہمدردی کا وصف کسی خارجی محرک کا نہیں بلکہ خود عامل اور سیکھنے والے کی اندرونی تحریک کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ جب ہمدردی سے پیش آنے کا موقع ہو تو اسے محسوس ہونا چاہیئے کہ اس وقت ہمدردی سے پیش آنا میری تعلیم کا ایک بنیادی جزو ہی۔ مدرسے میں سچ مچ کے تجربے کی ضرورت پر جن اسباب کی بنا پر زور دیا گیا ہی، وہ اس ایک مثال سے ظاہر ہیں۔ زندگی کے نئے حالات کے ماتحت اور مدرسے میں بچوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ہم یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ ہمارے مدرسے ان بنیادی اوصاف کی تحصیل

کے اگر واحد نہیں تو بہترین موقع سے بچّوں کو محروم رکھیں۔ اگر ہمارے مدرسے زندگی کی جولانگاہ نہیں بنتے ہیں تو ان کا یہ فعل ہو بہو ایسا ہی ہوگا جیسے سماج کی اخلاقی خودکشی۔ یہ کام بہرحال ہونا ہے اور اس کی ذمے داری سب سے زیادہ مدرسے پر ہے۔ مدرسے کے لئے اس کام کا واحد راستہ تجربہ و آزمائش ہے۔ مسئلہ میرے خیال میں اب صاف اور بالکل واضح ہے۔

سیکھنے کا ایک دوسرا اصول یہ ہے کہ ہم وہ سب کچھ نہیں سیکھتے جس کی ہم مشق بہم پہنچاتے ہیں۔ ہم وہی چیز سیکھتے ہیں جس میں ہمیں کامیابی ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں سمجھئے کہ جب ہم کوئی چیز حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس میں ہماری کچھ کوششیں کامیاب ہوتی ہیں اور کچھ ناکام، تو ہم اُسی طریقے پر کام کرنا سیکھتے ہیں جو کامیاب ہوا ہے اور اس طریقے پر کام کرنا نہیں سیکھتے جس میں ناکامی ہوئی ہے۔ ماہرین نفسیات کا اس قانون کی تشریح میں اختلاف ہے۔ مگر خود قانون مختلف فیہ نہیں ہے اور ہمارے اس وقت کے استدلال کے لئے کافی ہے۔ ایک قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ سیکھنے والے کے اشتیاق کو افعال کی تعیین میں کس قدر دخل ہے کہ کون سا فعل ہماری سیرت میں جذب ہو کر ہمارے لئے عمل کا محرک بن سکتا ہے اور کون سا فعل ایسا ہے جو ہماری سیرت کا جزو نہیں بن سکتا اور جس سے ہمیں احتراز کرنا چاہیئے۔ اس اصول کے مطابق اگر کوئی ٹینس کا مبتدی کسی خاص اسٹروک کو سیکھنا چاہتا ہے تو وہ اپنی کامیابی اور ناکامی دونوں سے فائدہ اٹھائے گا۔ اس کی وہ حرکات جن سے اس کی کامیابی مسلم ہوتی ہے بہم مشق سے بتدریج اس کے نظامِ عصبی کا جزو بن جائیں گی اور گیند کو اسی

اندازمیں مارنے کا رجحان روز بروز ترقی کرتا جائے گا۔ اسی طرح وہ حرکات جن سے اسے ناکامی ہوتی ہے، اس کی سیرت سے خارج ہوتے جائیں گے۔ اور گیند کو اُس انداز میں مارنے کا رجحان روز بروز کم ہوتا جائے گا۔ تو اگر شوق اس قدر پختہ ہے کہ اس کا نتیجہ پیہم مشق کی صورت میں ظاہر ہو، اس قدر پختہ ہو کہ کامیابی اور ناکامی کے باریک سے باریک فرق کو محسوس کرا دے، اور اس کے ساتھ ساتھ کامیابی پر حقیقی مسرت و اطمینان حاصل ہو اور ناکامی پر اسی طرح افسوس اور رنج ——— اگر یہ سب شرائط پوری ہو جائیں ——— تو پھر سیکھنے کا عمل کامیابی اور ناکامی دونوں سے خود بخود پورا ہو جاتا ہے اور کھلاڑی میں اسٹروک لگانے کی حرکت اس طرح رچ جاتی ہے کہ وقت آنے پر وہی اسٹروک غیر شعوری طور پر خود بخود لگ جاتا ہے۔ غرض اس اسٹروک کو سکھلانے والا محرک اس اسٹروک کو سیکھنے کا اشتیاق تھا۔ پہلے پہل تو کامیابی سے زیادہ اکثر ناکامی کی مشق ہوئی مگر شوق اور خواہش کی شدت کی بدولت وہ مطلوب طریقہ بالآخر آگیا۔ تو معلوم ہوا کہ سیکھنے کا عمل اس رخ پر کار پرداز ہوتا ہے جو شوق اور خواہش مقرر کرے۔

یہی اصول سماجی اور اخلاقی دنیا میں بھی صادق آتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے طالب علم اچھے اوصاف کے حامل ہو جائیں تو اس ذیل میں وہ خود جس طریقے پر چل کر کامیاب ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، اسی طریقے کو اختیار کر کے ہم بھی کامیابی کی امید کر سکتے ہیں۔ یہاں بھی حقیقی زندگی کا ماحول پیدا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ ہم (پہلے قانون کے حسبِ منشار

مطلوبہ اوصاف کی مشق کے مواقع بہم پہنچائیں بلکہ (دوسرے قانون کے بمصداق) یہ بھی ضروری ہی کہ ان کے اندر اچھے اوصاف کی طلب پیدا کرنے کا سامان بھی مہیا کیا جائے۔ مشاہدے سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ کسی بد اخلاق طالب علم کو اچھے طور وطریق سیکھنے کے لئے اس کے ہم جماعت کے اطوار جس قدر آمادہ کر سکتے ہیں، اتنا تنہا معلم نہیں کر سکتا ہذا دیکھنا چاہیئے کہ استاد دوسرے طالب علموں میں اچھے سماجی طور طریق کی کس حد تک تحریک کر سکتا ہی یا تعلیم وتعلّم کا بہترین ماحول وہ ہی جب ایک مشترک مہم میں استاد اور شاگرد مل جل کر کوشش کریں اور کام کی ہر مشق اور ہر کوشش کا معیار کوئی خارجی حکم نہ ہو بلکہ وہ عام انداز ہو جس پر مشترکہ زندگی میں عمل ہوتا ہی۔

ان حالات میں ایک قابل استاد ہر اس موقع سے فائدہ اٹھائے گا جس کے ذریعے بچے قابل قدر اوصاف کی نفع بخش مشق کو بڑھا سکیں اگر وہ "احساس ذمہ داری" کے وصف کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں ذمے داری کی مشق اس طرح کرنی ہوگی کہ اس کی انجام دہی ان کے ضمیر کا جزو بن جائے۔ اگر یہ بات کافی ذوق وشوق اور کافی متنوع مشق اور کسی قدر کامیابی کے ساتھ حاصل ہو جائے (کامیابی اس لئے کہ اس سے زیادہ کامیابی کی ضامن اور کوئی چیز نہیں ہوتی اور آگے چل کر اسی کا عمل دخل ہوگا) تو ہر طالب علم میں اپنی اپنی روش اور تجربے کے مطابق ذمہ داری کا ایک ترقی پذیر احساس پیدا ہو جائے گا۔ مقدمات کا تعین ہونا چاہیئے۔ نتیجہ لازمی طور پر سامنے آئے گا۔ غرض سماجی ماحول جس نقطہ نظر سے دیکھئے سماجی اوصاف کی تحصیل کے لئے شرط لازم ہی۔

سیکھنے کا ایک اصول یا شرط اور ہے اور اس کا بھی تقاضا ہی کہ سماجی ماحول میں حقیقی تجربہ کیا جائے۔ اس اصول کی بنیاد یہ امید ہی کہ اطلاق اسی چیز کا ہوگا جو سیکھی جا چکی ہو۔ کسی زمانے میں یہ خیال تھا کہ کسی خاص وصف، مثال کے لئے استدلال کو لے لیجئے، اس کی مہارت سے ہر موقع پر کام لیا جا سکتا ہی خواہ اس کا وقت ہو یا نہ ہو۔ اس اصول کے مطابق اگر کسی لڑکے نے اقلیدس میں استدلال کی معقول قوت بہم پہنچائی تو سمجھا جاتا ہی کہ زندگی میں کوئی بھی صورتِ حال پیدا ہو جہاں استدلال کی ضرورت پیش آئے، ہر صورت میں وہ نسبتاً بہتر استدلال کر سکتا ہی۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ اس دیرینہ امید کا مفہوم غلط سمجھا گیا تھا اور اس میں ضرورت سے زیادہ مبالغے سے کام لیا گیا تھا۔ ایک صورت میں حاصل کی ہوئی مہارت دوسری میں اسی وقت کام دے سکتی ہی جب اس دوسری صورت میں ایسے عناصر موجود ہوں جو پہلی صورت میں سیکھی ہوئی باتوں کی نہ صرف ضرورت ظاہر کریں بلکہ ان کے طالب بھی ہوں۔ ایک لڑکا جس نے اقلیدس میں مہارت پیدا کر لی ہی، اگر مشینوں کے علم کا مطالعہ کرتا ہی تو اُسے اپنی اقلیدس کی نہ صرف ضرورت ہوگی بلکہ غالباً وہ یہی سوچے گا کہ مجھے اس قوتِ استدلال کے استعمال کی بھی ضرورت ہی، جسے میں نے اقلیدس کی تحصیل کے سلسلے میں بہم پہنچایا ہی اس لئے کہ مشینوں کے علم میں اقلیدس کی ضرورت کے ساتھ ساتھ استدلال کی اس نوعیت کی طرف بھی اشارہ ہی جس میں اقلیدس کے مطالعے کے موقعے پر مہارت حاصل کی گئی ہی۔ مگر گھوڑے کی تجارت کی بات اس سے بالکل مختلف ہی۔ وہی لڑکا جس نے اقلیدس میں مہارت پیدا کی ہی، مگر گھوڑوں سے ناواقف ہی، گھوڑوں کی تجارت

میں غالباً اپنی اقلیدس کی نہ کوئی ضرورت محسوس کرے گا اور نہ اس استدلال کے استعمال کا کوئی موقع دیکھے گا جس میں اس نے مہارت بہم پہنچائی ہے۔ یہ تو البتہ ممکن ہے کہ وہ "غور و فکر" ملتوی کر دے اور مقدمات و نتیجہ کی تحلیل و تجزیہ شروع کر دے۔ یہ امکان کہ اس کی اقلیدس نئی صورتِ حال کے مطابق غور و فکر کرنے میں اس کی ممد ثابت ہوگی ایک حد تک اس طریقہ و منہاج پر منحصر ہے جس پر اس نے قدیم صورتِ حال میں استدلال کرنا سیکھا ہے۔ اگر اس کی تعلیم اس انداز پر ہوئی ہے کہ وہ اخذِ نتائج میں وسعتِ فکر سے کام لے سکے تو ممکن ہے کہ نئی صورتِ حال میں اپنی سابقہ تعلیم اور اس کے اثرات کا اطلاق کرے۔ مگر سابقہ تعلیم کے اطلاق میں اہم ترین بات نئی اور پرانی صورتِ حال کی یکسانیت و مشابہت ہے۔ ایسے حالات میں "عمل انتقال" کا واقع ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ بہترین "عملِ انتقال" کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ نئی صورتِ حال حاصل کی ہوئی قوت کی اجازت دے بلکہ اس کے اندر کچھ ایسی بات بھی ہونی چاہیئے جو اس طاقت کے استعمال پر زور دے۔ ظاہر ہے کہ اثناء تعلیم کی صورتِ حال جس قدر نئی صورتِ حال سے مشابہ ہوگی، اسی قدر یقین کے ساتھ عمل انتقال واقع ہوگا اور اسی قدر یقین کے ساتھ تعلیم کی ضرورت اور اس کے استعمال کا احساس ہوگا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر بھی ہماری آرزو ہے کہ مدرسہ زندگی سے مشابہ ہو۔ جہاں تک تعلیم کے منتقل ہونے کے امکان کا تعلق ہے، مدرسے کی زندگی باہر کی زندگی سے جتنی ہی قریب ہوگی اتنا ہی اچھا ہوگا۔ غرض ہم چاہتے ہیں کہ مدرسہ اپنے یہاں ایسے تجربات کرائے جو مدرسے کے باہر کی دنیا کے بہترین تجربات کے عین حسبِ حال ہوں۔ غرض پھر

وہی مطالبہ کہ اگر بہترین تعلیم دینا مقصود ہو تو مدرسے کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو زندگی کی جولانگاہ بنائے۔

یہ تو ہیں تعلیم کی بنیادی شرطیں۔ ان کے علاوہ دو اور ضمنی شرطیں بھی ہیں جن پر ہمیں اپنے موضوع کے اس پہلو کو ختم کرنے سے پہلے غور کر لینا چاہیئے! ان میں سے ایک تو ہی تعلیم بذریعۂ ربط اور دوسری یہ اصول کہ تعلیم مجرد نہیں ہونی چاہیئے۔ ربط کے بارے میں تو ہم سب اس مسئلے سے واقف ہیں کہ تجربے کے وقت جب دو چیزیں ساتھ ساتھ واقع ہوتی ہیں تو ایک کا خیال آتے ہی دوسری چیز بھی ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں دونوں چیزوں میں تعلق جتنا ہی گہرا ہوگا، یہ تعلق خواہ خوشگوار ہو یا ناخوشگوار، اتنا ہی زیادہ ایک کے ساتھ دوسری چیز کے یاد آنے کا امکان ہوگا۔ یہی قانونِ ارتباط تعلیم میں ہمیں اتنا آگے لے جاتا ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو اس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں سب سے قدیم مثال پاؤلو POWLOW کے کتے کی ہے۔ قصہ یوں ہے کہ کتے کے سامنے نہایت خوش ذائقہ اور خوشبودار گوشت رکھا گیا۔ گوشت کی خوشبو پاتے ہی کتے کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ٹھیک اسی وقت مدھم آواز میں گھنٹی بجائی گئی یہی عمل کئی روز تک متواتر کیا گیا، گوشت رکھنا اور اسی وقت گھنٹی بجانا۔ اور ہر روز کتے کے منہ میں پانی بھر بھر آتا آخر میں بغیر گوشت رکھے محض گھنٹی کے بجا دینے سے کتے کے منہ میں پانی بھر آیا۔ قانونِ ربط کا عمل پورا ہو گیا تھا۔ ایک فعل (منہ میں پانی بھر آنا) جو پہلے پہل ایک فطری محرک (جیسے گوشت کی خوشبو) سے مربوط ہو کر ظہور پذیر

ہوا تھا اب ایک اتفاقی محرک (گھنٹی کا بجنا) سے ظہور پذیر ہونے لگا جس میں اوّل اوّل اس قسم کی مطلق صلاحیت نہ تھی۔ اس قانون کو کوئی "عمل ربط کے ذریعے پیدا ہونے والی تبدیلی" کہتا ہے کوئی "کیفیت آفرینی"۔ تعمیرِ عادات میں اس کا اتنا دخل ہے کہ بہت سے لوگ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بیشتر جذباتی افعال انسان کی سیرت میں اسی راستے سے داخل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوف قدرت کی ودیعت کردہ ایک اضطراری کیفیت ہے۔ ہم جس چیز سے واقعی ڈرتے ہیں ہمارے دل میں اس کا گذر بھی بیشتر اِسی عمل ربط کے راستے سے ہوتا ہے۔ ہم اپنی خاص کمزوریوں کا ادراک اسی کے ذریعے کرتے ہیں۔ ہمارے مذاق میں لطائف و قبائح کا احساس اسی راہ سے آتا ہے۔ ایک نہایت معقول اور اپنے کام میں ملنے ہوئے صاحب نے راقم الحروف سے ایک خاص رنگ سے اپنی نفرت کا بڑی بے تکلفی سے اعتراف کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ رنگ ان کے بچپن میں ایک نہایت بے لطف اور غیر دلچسپ نصاب کی کتاب کو تعلق رکھتا تھا جو انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ غیر دلچسپ نصاب تو وہ صاحب بھول گئے تھے، مگر اس کے رنگ سے جو کراہیت پیدا ہو گئی تھی، وہ باقی رہی۔

اب ہم دوسری شرط کی طرف آتے ہیں جو گویا اسی پہلی شرط کا تتمہ ہے۔ ہم ایک وقت میں محض ایک ہی چیز نہیں سیکھتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی باتیں سیکھتے ہیں۔ ہم جو کام بھی کرتے ہیں، وہ ہمارے سامنے اپنے ساتھ بہت سے پہلو اور متعلقات بھی لاتا ہے۔ ان پہلوؤں یا متعلقات

یں سے ہر ایک کے متعلق ہمارے دل میں کوئی نہ کوئی خیال بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح ایک ہی ساتھ بہت سی باتوں کی تعلیم ہو جاتی ہے۔ ایک لڑکا مدرسے میں ایک نظم یاد کر رہا ہے۔ اب اس کوشش کے متعلق اور اُس نظم کے متعلق خواہ موافق یا ناموافق اس کے دل میں ایک خیال بیٹھ جائے گا۔ اب یہی خیال اور اس کے اثر سے پیدا ہونے والے بہت سے رد عمل اس نظم سے متعلق متعدد چیزوں کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر پر اثر انداز ہوں گے ——— عام نظم کے متعلق اس کا خیال اس استاد کے متعلق اس کا خیال جو نظم کی تعلیم کا اہتمام و انصرام کرتا ہے، اس مدرسے کے متعلق اس کا خیال جہاں ایسی باتیں ہوتی ہیں، زندگی میں جمالیاتی اور خالص علمی ذوق کے متعلق اس کا خیال (ہائی برو" (HIGHBROW) سے بے بِٹ (BABBIT) کی نفرت کا افسانہ آپ جانتے ہی ہیں) مدرسے کی حکومت کے متعلق اس کا خیال (اور اسی حکومت پر اندازہ کر کے تمام حکومتوں کے متعلق اس کا نظریہ کہ حکومت آیا خون آشاموں کی ایک جماعت کا نام ہے یا اس کے برعکس مل جل کر رہنے سہنے کا ایک بہترین ذریعہ) یہ باتیں تو ان بے شمار باتوں میں سے چند نمونے ہیں جو اس ذیل میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان بے شمار باتوں سے جو کسی چیز کی تعلیم کے ذیل میں آتی ہیں اور جنھیں ہمارا ذہن قبول کر لیتا ہے، وقت آنے پر زندگی کے نہایت موثر

HIGH BROW. خالص امریکی بول چال کا ایک لفظ ہے۔ وہ شخص جو سیاسیات وغیرہ کو جذبات سے الگ ہو کر خالص عقلی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا مدعی ہو۔ (مترجم)

اور کارگر اندازِ فکر کا ظہور ہوتا ہے جو بچپن ہی میں پختہ ہو کر ہمارے جذباتی اور ارادی منتہائے نظر پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اس خیال کے لئے اچھے خاصے دلائل موجود ہیں کہ مذکورہ بالا احساسات و میلانات جو نہایت اہم اور بنیادی ہوتے ہیں ان کی تشکیل بچپن ہی کے زمانے میں ہو جاتی ہے۔ (یہی وہ خیال ہے جس سے نرسری اور کنڈر گارٹن کے مدرسوں کے لئے دلیل ملتی ہے) مگر تشکیلِ رجحانات کے باب میں ہمارا خیال ہے کہ اسکول کی زندگی کا پورا زمانہ اہمیت رکھتا ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی نہیں بلکہ اور بہت سی باتیں سیکھی جاتی ہیں۔ عمل ربط اس تمام عرصے میں سیرت کے ارادی اور جذباتی دونوں پہلوؤں کی تعمیر کر رہا ہوتا ہے۔

نئے اور پُرانے مدارس کا موازنہ

جس پہلو سے بھی دیکھئے مدرسے کے قدیم تصور کی ناموزونیت مسلّم ہے۔ جہاں بد دل بچے روزانہ محض حفظ کرنے کے مقصد سے پڑھائی کی چکی میں پستے تھے۔ اور پڑھائی بھی گذشتہ سماجی مسائل کے حل کے لئے ان وسائل کی جنھیں نسل ہا نسل پہلے بڑے بوڑھوں نے اپنے لئے مرتب کر رکھا تھا۔ اب ایسی پڑھائی نہ صرف ناموزوں ہے بلکہ مختلف پہلوؤں سے بیشتر مضر بھی پڑتی ہے۔ تعجب اس بات پر نہیں ہے کہ آدھے سے زیادہ طالب علم قانون کی گرفت سے نکلتے ہی مدرسے کو چھوڑ بیٹھتے تھے، یہ بھی کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ بہت سے لوگ بہ حیثیت شہری کے اپنی ذمے داریوں کی طرف سے افسوسناک حد تک بے پروائی

برتتے ہیں۔ تعجب یہ ہو کہ اس کے باوجود حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور جوں کے توں رہی۔

نئے ڈھنگ کے مدرسوں نے ان باتوں سے اپنے وجود کے جواز میں سند لینا شروع کر دیا ہو۔ ان کے دستور کار میں نظم وصحت کی جو کمی نظر آتی ہو وہ نتیجہ ہو ایک کوشش کا کہ مدرسے میں زیادہ سے زیادہ زندگی ہو، حقیقی تجربہ کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ہو اور ضبط نفس کی زیادہ سے زیادہ مشق بہم پہنچے۔

سیکھنے کے مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق جمہوریت میں جمہور کو جس قسم کے ضبطِ نفس کی ضرورت ہوتی ہو وہ اسی وقت سیکھا جاتا ہو جب اس کی مشق کے لئے اسی طرح کی فضا موجود ہو جو باہر کی جمہوری دنیا میں نظر آتی ہو۔ لہٰذا مدرسے اپنی تنظیم کو زیادہ سے زیادہ جمہوری النوع بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ طالب علموں کو اپنے اندر ضبط نفس اور دوسرے سماجی و مدنی اوصاف پیدا کرنے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت محسوس ہو اور نہ صرف ضرورت محسوس ہو بلکہ انھیں اس کی مشق کا حسب منشا موقع ملے۔ یہی وجہ ہو کہ اچھے مدرسے اپنے معاملات میں طالب علموں کی شرکت کی حمایت کرتے ہیں ان کی خواہش ہوتی ہو کہ ان کے طالب علموں کا کام بامقصد اور براہِ راست ہو۔ بہ الفاظ دیگر اگر ہم نئی تعلیم کی تہ میں جا کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہاں جو کچھ ہوتا ہو وہ لاڈ پیار نہیں ہو بلکہ تعمیر اخلاق میں بہتر سے بہتر جو ذرائع ہو سکتے ہیں انھیں کام میں لانے کی ایک سنجیدہ کوشش ہو۔ یہ نرمی نہیں ہو بلکہ اس

کے پیچھے طریقۂ تعلیم کا بہتر سے بہتر اور مرتب علم رکھنے والے معلم کا بیدار تخیل ہی۔ ان حالات میں ہماری جو کچھ خواہش ہی، وہ یہ ہی کہ ہم ماحول اور اس کے اقتضار، باہر کی دنیا اور مدرسے کے درمیان جو تعلق ہی، اس کا تفصیل سے مطالعہ کریں اور پھر فیصلہ کریں کہ مدرسے پر سماج کے جو مطالبات ہیں، انھیں پورا کرنے کے لئے انھیں کیا ہونا اور کیا کرنا چاہیئے۔ مگر واضح رہی کہ یہ مطالعہ تعلیم کے بنیادی اصول کی روشنی اور رہنمائی میں ہونا چاہیئے اس لئے کہ ہماری منزل تعلیم ہی ہے اور اچھے اطوار اور عمل کی تعلیم اور تعلیم اس وقت ہوتی ہی جب تعلیم کے گروں کی پابندی کی جائے۔ نئے ڈھنگ کے مدرسے تو اچھی باتوں کی طرف پہلے ہی چل پڑے ہیں، ہماری یہاں کی گفتگو ممکن ہی، مدرسے اور پبلک دونوں کی مدد کر سکے۔ اگر ہم مدرسے کے مقصد کا صحیح اور صاف مفہوم پا جائیں تو مدرسہ اس مقصد تک پہنچنے کی اچھی سے اچھی راہ خود نکال لے گا۔ ممکن ہی اسی اثنا میں پبلک مدرسے میں آئے دن کی نئی نئی تبدیلیوں کا راز بھی سمجھ جائے اور جب وہ یہ راز سمجھ لے گی تو مدرسے کی مدد بہتر طریقے پر کر سکے گی۔ غرض ہم سب کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ اپنی فہم سے کام لیں، سوچیں اور سمجھیں۔

مدرسے کی نئی ذمّے داریاں

اب سوال یہ ہی کہ مدرسے کا نظام العمل کیا ہو؟ مگر اس سوال پر تفصیل سے غور کرنے سے پہلے اچھا ہوگا کہ ہم اپنے مسئلے کے ان نمایاں عناصر کو

یکجا کرکے جن کا ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں ہے اور جن پر ہم نے الگ الگ اب تک بحث کی ہے، ایک مرتبہ پھر مطالعہ کریں، تکرار تو ہوگی، مگر خیر، ہمارے سامنے جو مستقبل ہے وہ اس قدر غیر یقینی اور تغیر پذیر ہے کہ اتنا پہلے کبھی نہیں تھا اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے بچے اپنے اندر اس صورتِ حال کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینے کی صلاحیت پیدا کریں جس کے متعلق ہم لوگ کہ ان کے معلم ہیں، محض ایک حد تک پیش بینی کر سکتے ہیں۔ اب اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نئی اور مختلف تعلیم پر زور دیا جائے، مقررہ سوالات اور ان کے جوابات کی تعلیم پر نہیں جیسا کہ اب تک ہوتا رہا ہے بلکہ حلّ مسائل کے ایسے طریقوں کی تعلیم پر جو نئے حالات میں مؤثر ثابت ہوں۔ اور آخر میں ہمیں اپنے شاگردوں میں لچک بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے اندر خود بخود اس طرح اور اس درجہ تبدیلی پیدا کرسکیں کہ ان سے پہلے کی کسی نوخیز نسل میں اس کا جواب نہ ہو۔ ہماری جانب سے انھیں اپنے منتخب اطوار و اقدار کا پابند بنانے کی کوشش، ان کے ہاتھوں کو، نہیں بلکہ ان کے دماغوں کو اس درجہ جکڑ دینے کے مرادف ہوگی جب کہ وہ بلبلا کر اپنی قید سے آزاد ہونے کے لئے جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں۔ جہاں تک خانگی آرائش و نمود یا تجارت میں میکانکی تدبیروں کا تعلق ہے، ہم بچوں کی تعلیم میں شاید اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں، مگر ان کے دماغ ان کے اخلاق، ان کے مذہب، ان کے فلسفے کا جب سوال آتا ہے تو ہم ہچکچانے لگتے ہیں اور پیچھا کھینچ جاتے ہیں جس طرح ارسطو کی ہمہ گیر تعلیم کے دقیق اور نکتہ سنجانہ اصول

ونظریات کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ دماغ اور روح سے تعلق رکھنے والی ان چیزوں میں قطعاً تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں تبدیلی ہو رہی ہے اور ہماری اپنی آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے۔ خاص طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ اب کوئی ایسا اخلاق ہمارے لئے کفایت نہیں کرتا، جس کی بنیاد کسی خارجی حکم یا سند پر ہو۔ سب سے پہلے والدین نے کسی حد تک ڈرتے ڈرتے اس اصول کو توڑا اور اب ہمارے نوجوان ان سے زیادہ جرات اور تیزی کے ساتھ اسے اور بھی پیچھے کی طرف دھکا دیتے جا رہے ہیں۔ ہم صرف اسی اخلاق پر عمل کر سکتے ہیں جس کی بنیاد کسی مدلل توجیہہ اور سماجی زندگی میں اس کی عمل پذیری پر ہو، اس حقیقت سے ہمیں نکتہ چیں نوجوانوں کو اس کی تعلیم دینے میں سہولت ہی نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس سے ہمیں وہ مقبول ترین بنیاد بھی حاصل ہوتی ہے جس کے مطابق ہم تبدیلی کی کسوٹی پر صحیح اترنے والے اصولِ اخلاق بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ مدرسے کو یہ مطالبات اپنے لئے بنیادی اصول سمجھ کر تسلیم کرنا پڑیں گے۔

ان بنیادی حقائق کے دوش بدوش جن کی اہمیت پہلے سے اب بہت زیادہ ہے، دوسرے معاملات بھی اسی شدت اور زور شور کے ساتھ آتے ہیں۔ سماج کے تیور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دباؤ اتنا زیادہ ہوگا کہ اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ دنیا کی ہر چیز روز بروز ضخیم سے ضخیم تر ہوتی جاتی ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ ہے تخصیص کار اور کسی ایک چیز میں مہارت خصوصی۔ اس کا

اقتضا؛ ایک طرف یہ ہے کہ انسان کے نقطۂ نظر اور اس کی دلچسپیوں میں پہلے سے زیادہ وسعت اور پختگی پیدا ہو، اور دوسری طرف یہ کہ اس کی اخلاقی اور انفرادی سیرت میں کافی مضبوطی ہو ورنہ زندگی کی عظمت کی تاب نہ لا سکے گا۔ جمہوریت مقتضی ہے افراد کے احترام اور مشترک مفاد کے لیئے تعاون کی آمادگی کی۔ ان دونوں صفات کا حصول بحالتِ موجودہ چند اسباب کی بنا پر مشکل نہیں بلکہ مشکل تر ہے۔ غرض مدرسے کو زور دینا چاہیئے ایک ایسی سیرت کی مضبوطی پر جو متحرک ہو اور جس میں انفرادی سے زیادہ اجتماعی پہلو زیادہ ہو، اور زور دینا چاہیئے اس ڈھنگ سے اور اس درجہ کہ دینا دنگ رہ جائے۔

مستقبل کے مسائل کا احاطہ کرنے کے لیئے ہمیں چاہیئے کہ سماج اور اس کے رجحانات و ذرائع کا باقاعدہ اور نہایت مفصّل مطالعہ کر کے جہاں تک ہو سکے، اس کی کھوج لگائیں۔ اس عمل کو ہمارے نصاب کی روح ہونا چاہیئے۔ اگرچہ ہم مستقبل کے سماجی مسائل کی کوئی یقینی تفصیل نہیں پیش کر سکتے ——— اور حقیقی تعلیم کے لئے ہونا بھی یہی اچھا ہے ——— تاہم حدود کے اندر رہ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چند غیر حل شدہ مسائل آگے چل کر اتنی شدت اختیار کریں گے کہ ان کو حل کرنے پر ہم مجبور ہو جائیں گے۔ ایک نا معلوم مستقبل کے لئے اوپر جس قسم کی تعلیم کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس کے لئے یہی مسائل عمر اور دلچسپی کی مناسبت سے نہایت عمدہ مضمونِ درس کا کام دے سکتے ہیں۔ یہاں اس بدلتے ہوئے مستقبل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے طریقے مرتب کئے اور سیکھے جا سکتے

ہیں۔ یہ بات کہ استاد ان مسائل کا جواب نہیں جانتے کام میں حارج ہونے کے بجائے ممد ثابت ہوگی۔ یہاں بھی سماج میں غلط اور صحیح کی توضیح کی طرف جسے آج تک حد سے زیادہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہی، اچھی طرح توجہ کی جا سکے گی۔ خود غرض لوگ جو سماج کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں، اس کی مخالفت کریں گے مگر یہ مخالفت اس کے خلاف دلیل ہونے کے بجائے اس کے جواز کا ثبوت ہوگی۔ لیکن اس مخالفت سے یہ چیز بھی عیاں ہوتی ہی کہ جس وقت ہم تعلیم کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کریں گے، اس وقت چند در چند مشکلات اٹھ کھڑی ہوں گی۔ اگر ہم اپنی ترقی کو اپنی نا اہلیت کی بنا پر حالاتِ زمانہ سے الگ نہیں رکھنا چاہتے، تو اہلِ امریکہ کے لئے ضروری ہی کہ وہ متنازعہ فیہ مسائل کی بحث وتمحیص کو گوارا کرنا سیکھیں جن کی طرف سے اب تک وہ غافل پڑے رہی ہیں۔ انھیں اس چیز پر زیادہ سوچ بچار سے کام لینا ہوگا کہ بے بس ولاچار نوجوانوں کے دماغوں کو جکڑ دینا کس قدر غیر اخلاقی اور سماج کے نقائص کی طرف سے ان کی آنکھوں کو بند رکھنا کس درجہ مضر ہی۔ اس وقت جبکہ ہم ایک بہتر دنیا کا خاکہ مرتب کرنے میں لگے ہوئے ہیں، بوڑھوں سے نمٹنا مشکل ہوگا۔ البتہ نوجوانوں کے لئے مستقبل کے سماجی مسائل اچھے سے اچھے علمی مضمون کا کام دیں گے۔

کچھ لوگ حیرت کریں گے کہ ایک ایسے نصاب میں جو پہلے ہی سے نہایت مفصل اور مضامین سے پُر ہی، سماجی مسائل کی تعلیم کے لئے جس کا یہاں مطالبہ کیا گیا ہی، وقت کہاں سے آئے گا؟ اس سوال کا جواب

نہایت صاف ہے۔ مدرسے کو بے جان چیزوں سے پاک کر دیجیے۔ جو لوگ تعلیمی مسائل سے اچھی طرح واقف ہیں، ان کی رائے ہے کہ ثانوی تعلیم کے موجودہ نصاب کے بجنسہٖ باقی رہنے کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ مدلل اور پختہ بنیادوں پر قائم ہے، بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی جگہ لینے کے لئے مرتب شکل میں کوئی قابلِ اعتماد مواد نہیں ہے۔ بیشتر طلبا کے حق میں لاطینی زبان کو بھی یونانی کے ساتھ ساتھ ردّی کی ٹوکری میں جگہ ملنی چاہیے۔ اسی طرح ریاضی کا بیشتر حصّہ بیشتر طلبا کے لئے غیر ضروری ہے۔ تاریخ کے نصاب کا بہت سا حصّہ اس قابل ہے کہ اس کی جگہ سماجی مسائل کا نصاب پڑھایا جائے (جس میں طلبا کو قدیم طریقے کی بہ نسبت تاریخ کا زیادہ ادراک ہوگا) بہت سے طالب علم عہد حاضر کی غیر ملکی زبانوں کی تحصیل کرتے ہیں، مگر ان زبانوں کی تعلیم کی بھی مشکل ہی سے حمایت کی جا سکتی ہے۔ انگریزی اور سائنس کے مضامین کا جہاں تک تعلق ہے، ان کی تنسیخ کے بجائے ان کی نئے سرے سے تشکیل کی ضرورت ہے۔ مضامین کے بارے میں میرے اس طرح کہنے کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ الگ الگ مضمونوں کی تعلیم بہترین تعلیم ہے۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور اس پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ مگر سماج کے علم کی تعلیم کے لئے وقت نکالنا اصل مسئلہ نہیں ہے۔ وقت بہ افراط مل سکتا ہے۔

کس قسم کے مدرسے کی ضرورت ہے

جب ہم اپنے مطلوبہ مدرسے کی نوعیت پر غور کرتے ہیں تو تین چیزیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں۔ اوّل، اسے زندگی کا مدرسہ ہونا چاہیے، حقیقی

تجربے کی تجربہ گاہ۔ تعلیم کے لئے جن شرائط کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کسی دوسرے مدرسے سے پوری نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے، مدرسے کو ایک ایسا مقام ہونا چاہیئے جہاں طلبا، تیز اور جوشیلے ہوں۔ ان کی سرگرمیاں تعلیم کے طریق کار کا جزو خصوصی ہوں اس لئے کہ با مقصد مشغلہ خود اچھی زندگی کا، وہ جہاں کہیں بھی بسر کی جائے، جزو خصوصی ہے۔ تیسرے، اس میں ایسے استاد ہونے چاہئیں جو ایک طرف بچپن کی زندگی سے ہمدردی رکھتے ہوں اور ہمدردی یہ سمجھ کر رکھتے ہوں کہ بچوں کی نشو و نما صرف بچوں کے ترقی پسندانہ مشاغل ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اور دوسری طرف یہ دیکھتے اور سمجھتے ہوں کہ نشو و نما دراصل وہی نشو و نما ہے جو وسعت پذیر ہو اور موثر قوتِ ضبط کی طرف لے جائے۔ وہ جانتے ہوں کہ نشو و نما جس کے پرکھنے کا معیار قوت ضبط ہو، اسی وقت ہو سکتی ہے جب عمل اور برتاؤ کے اچھے سے اچھے اور مناسب تر طریقے اس طرح حاصل کئے جائیں کہ مزید ترقی کی ہر وقت گنجائش رہے۔ انھیں معلوم ہو کہ اس کے لئے گذشتہ نسلوں کے تجربے اور ذخیرہ معلومات ایک بے مصرف خزانہ ہے جو نہ پسندیدہ ہیں اور نہ مکمل، مگر اس کے باوجود ملتے ہیں اور ان کا خوب استعمال بھی ہوتا ہے۔

مدرسے میں تقلیدی تجربہ[1]

اس سے پہلے ہم نے اس مسئلہ پر بحث کی ہی کہ مدرسے کی حیثیت زندگی کی جولانگاہ کی ہی۔ اس سے کچھ لوگ شاید یہ سمجھیں کہ دوسروں کے کامیاب تجربات کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہی ایسا منفی پروگرام شروع ہی سے حد درجہ لغو ہوگا۔ نسلی تجربات کا اندوختہ ہماری زندگیوں پر اس قدر چھایا ہوا ہی اور ہمارے رگ وپے میں اس قدر سرایت کیے ہوئے ہی کہ شاید ہوا بھی جس سے ہم سانس لیتے ہیں، اس درجہ محیط نہیں ہی۔ گھر میں رہنا، کپڑے پہنا، کرسی پر بیٹھنا کھانا پینا، باتیں کرنا ——— ان میں سے ایک چیز بھی نسلی تجربات کو مقلدانہ انداز میں اختیار کیے بغیر ممکن نہیں۔ واقعہ یہ ہی کہ ہم نے کردار وعمل کے ان ڈھنگوں اور ذریعوں کو جس طرح اپنانا یا برتنا سیکھا ہی، وہی بیشتر ہمارے تجربے میں بھی آتا ہی۔ تو کیا اس باب میں اب کوئی دقت طلب امر نہیں ہی؟ ہی۔ ممکن ہی تجربے کے مفہوم کے متعلق چند باتیں اس مسئلے کی توضیح میں ممد ثابت ہوں تجربے سے بالعموم وہ بات مراد لی جاتی ہی جو کسی کو پیش آئے جیسے مجھے جل جانے کا تجربہ ہو۔ تجربے کا یہ انفعالی پہلو بھی ہی مگر

---

[1] تقلیدی میں سنے (VICARIOUS.) کا ترجمہ کیا ہی۔ صاحب STANDARD D نے "مفوضہ" ترجمہ کیا ہی۔

یہی اور صرف یہی نہیں ہے۔ اور نہ تعلیمی مقاصد کے لئے اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ تجربے میں جس کو بہت زیادہ اہمیت ہے وہ ہے وہ بات جو ہم کسی ردِ عمل یا زیادہ صحیح الفاظ میں کسی اختراعی محرک کے زیر اثر خود بخود کرتے ہیں۔ تجربے پر جب ہم ہر پہلو سے غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فاعلی پہلو بھی ہے اور انفعالی بھی ہے، دونوں ضروری ہیں اور ہم دونوں کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ مگر جس کے ذریعے ہم اپنی حیات کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچتے ہیں، وہ ہے تجربے کا فاعلی پہلو۔ اس میں ہم حیوانات اور نباتات کی زندگی سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ تجربے کی اعلیٰ ترین قسم وہ ہے جس میں سب سے زیادہ ہماری خودی کو دخل ہے۔ اس طرح کے تجربے کے متعلق ہم اکثر کہتے ہیں کہ کام کی تحریک خارج سے نہیں بلکہ داخلی طور پر ہوتی ہے۔ اس باب میں واقعات ذرا پیچیدہ ہیں۔ جب ہم کسی بڑے واقعے پر غور کرتے ہیں تو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا سب سے پہلے کسی داخلی کیفیت کو تحریک ہوئی یا کسی خارجی ضرورت کو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک ضرورت کا پہلے پہل احساس ہوتا ہے اور وہ ہمیں کام کے لئے ابھارتا ہے اور کبھی دنیا کو بہتر بنانے کا حد درجہ اشتیاق سب سے پہلے ہمیں کسی خاص ضرورت کا احساس کراتا ہے جیسے روحانی بھوک کی تسکین۔ اس طرح کی آرزوئیں ہمیں بہر حال موقعے کے اقتضار کا احساس بنا دیتی ہیں۔ اور اس صورت میں فوری عمل کے محرک کا احساس اس سے پہلے کی کسی نظر کے انداز پر ہوتا ہے جب کسی ضرورت کے موقعے پر جس کا ہمیں خود بخود احساس ہوا ہو

اور ہم نے ہزاروں ممکن محرکات میں سے ایک محرک پر عمل کیا ہو۔

یہاں جس چیز پر زور دینا مقصود ہو وہ یہی پہنچ ——— تجربے کا یہی فاعلی پہلو ہے جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہو۔ سیرت جتنی ہی اچھی اور اس کی تعمیر جتنی ہی پختہ ہوگی، اتنی ہی یہ چیز اس میں نمایاں نظر آئے گی۔ جو شخص اس طرح کی سیرت کا حامل ہوگا، وہ ہماری اصطلاح میں مستغنی اور مکمل ہوگا۔ اس کی ذات معلول سے زیادہ علت بنتی ہی، اور اسی لیے وہ آزادی سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہوتا ہی۔ وہ زمانے کے ہاتھ کی کٹھ پتلی نہیں بنتا۔ وہ تقلیدی تجربات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہی۔ اور اگرچہ وہ دوسروں کی بتائی یا مرتب کی ہوئی باتوں کو اختیار کرتا ہی مگر جنھیں وہ خود محسوس کرتا ہی اور جو اس کی اپنی مرضی کے ہوتے ہیں اس طرح وہ ان کو ذریعے کے طور پر اختیار کرتا ہی اور غلاموں کی طرح انھی کا ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ ان کو اپنا بنا لیتا ہی۔ تجربے کی یہی فاعلی، رضامندانہ اور عملی شکل ہی جس پر یہاں زور دیا جا رہا ہی۔ جس انداز پر اس کی مشق بہم پہنچائی جائے گی، اسی طرح پر اس میں ترقی ہوگی۔ تعلیم میں جس کی بنیاد صحیح تخیل پر ہو، اس طرح کے تجربے کا ترقی پذیر استعمال خود ایک مقصد ہی اور مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ بھی۔ اس فاعلی تجربے کی بہم رسانی بھی نئے ڈھنگ کے مدرسے کا ایک فرض ہی۔

مدرسے میں معاشرتی تجربہ

اب ایک قدم اور آگے چلئے۔ اس نہج پر جو تجربہ کیا جائے اس کی نوعیت سماجی ہونی چاہیئے۔ سماجی رنگ دیئے بغیر تجربہ یقیناً ادھورا اور ناقص رہے گا۔ اس باب میں سب سے پہلے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ تجربہ اپنے ہم جنسوں کا ہونا چاہیئے اور انھی کے ساتھ رہ کر ہونا چاہیئے۔ اچھے مدرسے میں طالب علم مختلف تجربات میں شریک ہوتے ہیں، تعلیمی غرض سے جو مشترک کام کیے جاتے ہیں، ان میں حصہ لیتے ہیں، کبھی کبھی مختلف اغراض و مقاصد کی کش مکش کا بھی احساس کرتے ہیں مگر بیشتر وہ ایسے ہی مقاصد میں شرکت کرتے ہیں جن پر سب کا اتفاق ہوتا ہے۔ جب کسی کو کسی سے براہِ راست سابقہ پڑتا ہے، تو اس وقت جو مساویانہ معاملت ہوتی ہے اُس میں چھوٹی جماعت اپنے دوبدو تعلقات کی بدولت دوسری اور تمام چیزوں سے قطع نظر نہایت قیمتی تعلیمی امکانات کی حامل ہوتی ہے، یہاں زندگی مختلف اطراف میں پھیلتی ہے۔ اس کے بعد بڑی جماعت آتی ہے، جہاں فرد محض اپنی ذات سے واسطہ رکھتا ہے، دوسروں سے نہ بات کرتا ہے نہ اس کی طرف نگاہ کرتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں ہم آہنگی پیدا کرنے کا مسئلہ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، سماج کے مشکل ترین مسائل میں سے ایک بن جاتا ہے۔ اس ہم آہنگی کو بہترین طریقے پر حاصل کرنے کی خاطر ہماری خواہش ہے کہ چھوٹی جماعت کے روابط بتدریج وسیع ہوتے ہوتے بڑے بڑے سالمات میں داخل ہو جائیں۔ اس غرض کے لئے متعدد ذرائع تلاش کرنا چاہئیں

جماعت کی کمیٹیاں اپنے سے بڑی اور دور کی جماعتوں سے ملاقاتوں، خط و کتابت، اور خدمات کے ذریعے اور ایک دوسرے کی اگلی اور پچھلی باتوں سے باخبر رہ کر تعاون کریں۔ اس باب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کہ یہ چیز محض نقل ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس کے ذریعے مطلوبہ تعلقات میں سچ مچ وسعت پیدا ہو۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھتے رہنا چاہیئے کہ اس کے پیدا کرنے میں بہت زیادہ تیزی یا ضرورت سے زیادہ کو دپھاند نہ ہو۔ اس باب میں ترقی کی رفتار جتنی ہم سمجھتے ہیں، اکثر اوقات اس سے بھی سست ہوتی ہے۔

چھوٹی جماعت کے تجربے کی رسائی دوسری طرف سماج کے تمدن تک ہو سکتی ہے۔ جو ہمارے چاروں طرف اداروں اور کتابوں میں محفوظ ہے۔ اس میدان میں رسائی قدرتی طور پر طلبا کے اجتماعی کاموں کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ انھیں کامیاب ہونے کے لئے جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، قوم کے محفوظ سرمایۂ عقل و حکمت کی ضرورت ہوتی ہے، اگر طلبا کو یہ سمجھنا ہے کہ قلعے اندر اور باہر سے کیسے دکھائی دیتے ہیں، تو کیا اس کے لئے قلعہ تعمیر کرنا ہوگا؟ کیا کتابوں اور تصویروں سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا؟ یہاں بھی تجربے کی توسیع تدریج ہونی چاہیئے نہ کہ اتنی تیزی سے کہ گویا یہ چیز یقینی ہے اور اسے جلد از جلد حاصل کر لینا چاہیئے۔ اگر طلبا خود ہی ضرورت محسوس کریں، کھوج لگائیں اور اپنے مقصد کو پا جائیں تو یہ کامیابی ان میں ضرورت کے وقت تلاش و جستجو کی عادت پیدا کر دے گی۔ اس کے علاوہ یوں بھی ہر وقت ہماری یہ خواہش ہونی چاہیئے کہ طلبا چست و چاق رہیں۔ بلکہ کسی قدر تشنہ بھی جیسے افلاطون

بھوکے کتوں کے متعلق کہتا ہے کہ شکار خوب کرتے ہیں۔ ہم اپنے طالب علموں پر اپنے خیالات وافکار کے ذخیرے نہایت تیزی سے لاد دیتے ہیں کہ وہ انھیں اپنے اندر جذب کرلیں تو اس وقت ہم ان کی نشو ونما نہیں کرتے بلکہ انھیں ذہنی بدہضمی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے یہ ہوتا ہے کہ انھیں علم سے نفرت ہوجاتی ہے۔ اس بات کا خوف نہ کیجیے کہ جس طریقے کی ان سطور میں حمایت کی جارہی ہے، اس سے ہمارے علوم لطیفہ کے اندوختے کی تحقیر ہوگی۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، جن لوگوں نے اسے آزما کر دیکھا ہے، ان کی رائے ہے کہ یہ طریقہ تمدّن کی تعلیم کے لحاظ سے —— بشرطیکہ تمدن کا ایک صحیح مفہوم پیش نظر ہو —— پرانے اور بیشتر رسمی طریقوں کی بہ نسبت زیادہ نتیجہ خیز ہے۔ یہاں شاید اس امر کی توضیح وتصریح کی چنداں ضرورت نہیں کہ تجربے کا یہ پھیلاؤ منطق کی ان فصیلوں کا شاذ ونادر ہی ساتھ دے گا جو مدرسے کے مضامین کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے چند بڑے لڑکے کنکریٹ کا ایک قلعہ بنا رہے تھے، کیا اس وقت وہ آرٹ کی تعلیم پا رہے تھے۔ جی ہاں، یہ منصوبہ آرٹ کے ایک بیدار مغز معلم کی معیت میں شروع ہوا تھا۔ مگر کیا وہ ساتھ ہی ساتھ تاریخ اور جنگ اور اس کے متعلقات کی بھی تعلیم نہیں پا رہے تھے؟ کیا وہ اسی ذیل میں کیمیا یا طبیعیات یا ہر وہ سائنس یا صنعت جس کی کنکریٹ بنانے کے سلسلے میں ہمیں ضرورت پڑتی ہے، نہیں سیکھ رہے تھے؟ اور کیا یہ انگریزی میں زبانی بات چیت کی تعلیم نہ تھی؟ اس لئے کہ نمائش کے روز انھیں پبلک کو وہ سب کچھ سمجھانا تھا جو قلعے کی تعمیر کے سلسلے

میں انھوں نے کیا تھا۔ پھر اجتماعی اخلاق کو بھی کیوں بھولیے اس لیے کہ اسی سلسلے میں وہ آپس کے اختلافات کو مٹانا اور اپنے کام میں لگے رہنا بھی سیکھ رہی تھے کہ پے بہ پے ناکامی بہت بڑی حد تک اخلاقی پختگی کو مشتبہ کردیتی ہی۔ اور کیا یہی اجتماعی اخلاق کی بڑی شکل کی تعلیم نہیں تھی؟ اس لیے کہ وہ لڑکے ان طول طویل جنگوں میں قلعے کی اہمیت کا مطالعہ کرتے تھے، جب ذاتی ہوس اقتدار کو بالآخر قانون اور امنِ عامہ کے سامنے جھکنا پڑتا تھا۔ یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سے عنوانات کے ماتحت وہ سیکھتے تھے تو پھر مضامین کا

کیا رہا؟ کیا تعلیم میں ان کے لیے جگہ ہی نہیں۔ مشاغل کے سلسلے میں اِدھر اُدھر کی سیکھی ہوئی باتوں کو آخرالامر ان باتوں سے مربوط کردینا چاہیئے جو منطقی طور پر اسی جنس کی ثابت ہوں تاکہ ان کے مجموعے سے وقت آنے پر ایک پرکھا ہوا کُل بن جائے اور اس طرح سے بہ اقتضائے وقت الگ الگ مضامین کی راہ کھلے۔ الگ الگ مضامین کی یہ شکل ہمیں تسلیم ہی، بشرطیکہ انفرادی ذوق اور اس کی پختگی اس کی الگ سے تعلیم دینے کی ضرورت واقعی محسوس کرادے۔ اس صورت میں تمام مضامین کی تعلیم موزوں نہیں ہوتی۔ مگر ابتدا میں سیکھنے کا عمل مضامین کی ترتیب سے زیادہ ان کے استعمال کا پابند ہوتا ہی۔ واقعہ یہی ہی، ہمیں اس کا علم ہونا چاہیئے اور اسی کی روشنی میں تعلیم دینی چاہیئے۔

تعلیم طلبائے کے مشاغل کے ذریعے

طلبا کا چست و چاق ہونا اور اُن کی کوششوں کا تعلیمی طریق عمل کا

جز و خصوصی ہونا، ــــــــــ ان پر ہم دوسرے عنوانات کے ماتحت بحث کر چکے۔ یہاں اب ہمیں اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان طریقوں سے نہ صرف یہ کہ سیکھنے کے عمل کی سب شرطیں تمام و کمال پوری ہوتی ہیں بلکہ سماج کے نقطۂ نظر سے جن خوبیوں کی ضرورت ہے، ان کی تعمیر بھی بطریق احسن ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اکتساب کے تیقّن میں اشتیاق اور طرزِ عمل کو کس درجہ دخل ہے۔ یہ چیز اس وقت معراجِ کمال پر ہوتی ہے جب طالب علم نہایت آمادگی کے ساتھ کسی ایسے کام میں لگے ہوں جسے وہ اپنا کہتے ہوں اور جس کے لئے ہر قسم کی ذمے داری لینے کے لئے تیار ہوں۔ اتنی بات تو بہر حال ہر معلّم جانتا ہے کہ اس شرط کی تکمیل اتنی آسان نہیں ہے جتنی اس کی خواہش آسان ہوتی ہے۔ مگر جس حد تک اس شرط کی تکمیل ہوگی اُسی قدر سیکھنے کے عمل کی دوسری شرطیں پوری ہونگی اور جو کام پیشِ نظر ہوگا، اس کے لئے ذمے داری کا ایک بیدار جذبہ پرورش پائے گا۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ با مقصد مشغلہ چونکہ خود ایک اچھی زندگی کی خصوصیت ہے، لہذا اسے مدرسے میں ایک مکمل زندگی کے نمونے کے طور پر نظر آنا چاہیئے۔ زندگی کا نمونہ اور حیاتِ واقعی کی ایک حقیقی مثال اور امکانات سے کس قدر معمور! کسی ایسے مقصد پر کاربند ہونا جیسے تعلیمی نقطۂ نظر سے قبول کرنا کافی حد تک مشکل ہو، بلا شبہ ایک ایسے موقعے سے دوچار ہونا ہے جہاں اخلاق کی آزمائش ہوتی ہے۔ ایسے موقعے پر معلّم سوچتا ہے: کیا یہ واقعہ اس قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے یا اسے یہیں چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور اپنی غلطی کا اعتراف کر کے کسی دوسرے مسئلے کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

ایسے موقع پر احتیاط اور قابلیت سے فیصلہ کرنا اور دیانت داری سے اس پر عمل کرنا بہت بڑی اخلاقی کامیابی ہی۔ اگر یہ کوئی مشترکہ کوشش ہے ——— اور ابتدائی مدارس میں زیادہ تر کوششیں مشترکہ ہی ہونی چاہئیں، اگرچہ سب نہیں ——— تو یہاں سماجی اہمیت کا موقع پیدا ہوگا۔ اس قسم کی کوشش جس درجہ ہوشیاری اور سمجھ سے انجام دی جائے گی، اسی قدر اخلاقی میدان میں ایک قدم آگے بڑھے گا۔ ذمے داری کی تعمیل میں ترقی اور مہارت بہم پہنچانے کا ایک اور صرف ایک راستہ ہی، اور وہ ہی ذمے داری کو قبول کرنا، ان تمام طریقوں سے امید ہی کہ ہم پختہ اخلاق جس کی ہمیں ضرورت ہی، تعمیر کرسکیں گے۔

نئی دنیا جس میں لحہ بہ لمحہ تبدیلی ہوتی رہتی ہی، غور و فکر کی سب سے زیادہ مقتضی ہی، طالب علموں کے کام جو صحیح رہنمائی میں ہو رہے ہوں، ان کے سامنے بہت سے خیال لا کھڑا کرتے ہیں اور وہ انھیں اس طرح تولتے اور جانچتے ہیں کہ اور کوئی چیز اتنا کر نہیں سکتی۔ خیال ہر منزل پر ضروری ہی اور اس منزل میں جس قسم کی رہنمائی کی ضرورت ہی وہ اسی خیال میں مضمر ہوتی ہی۔ اس تمام عمل میں اور اس کے بعد بھی ایک خیال کا دوسرے خیال سے ربط ہوتا ہی تاکہ ہر ایسا تجربہ آئندہ استعمال کے لئے مع اپنی تمام جزئیات کے منظم و مرتب ہو سکے۔ واضح رہی کہ اس تنظیم و ترتیب میں ناکامیاں بھی اتنی ہی اہم ہوتی ہیں جتنی کامیابیاں۔ غرض سوچنا طالب علموں کی زندگی اور سیرت کے تانے بانے میں پیوست ہوتا ہی۔ اس کے علاوہ اس طرح کے کاموں میں اگر طالب علموں کو دلچسپی ہوتی ہی، تو وہ کامیابی کی حسبِ معمول شرائط کے ماتحت ان تمام باتوں کو بھی جو اس کام کے ذیل میں آتی ہیں دل لگا کر سیکھیں گے

وہ اہم اور ایک دوسرے سے مربوط باتیں جن پر ہم پہلے بحث کر آئے ہیں اگر طالب علموں میں دلچسپی اور کوشش کا جذبہ ہو اور اس نتیجے میں انھیں معقول کامیابی نصیب ہو اور ساتھ ہی ساتھ انھیں استاد اور مدرسے کی رہنمائی اور مناسب تعاون حاصل ہو تو اچھی چیزوں کے معاملے میں ان کے اندر پسندیدہ طرزِ عمل کی تخلیق کا بہت بڑی حد تک یقین ہے ——— پسندیدہ طرزِ عمل خود اس کام کے معاملے میں، مدرسے کے معاملے میں، استاد کے معاملے میں، مطالعے اور کوشش کے معاملے میں اور خود ان کی اپنی ذات کے معاملے میں اس حیثیت سے کہ وہ اس میدان میں نہایت لائق کارکن ہیں۔ ان سب باتوں کو خلاصۃً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جس حد تک پُرجوش دلچسپی طلباء کو ان کے حسب منشاء کام پر ابھارے گی ——— ایسا کام جو کافی تعلیمی مواد کا حامل ہو، اور جو نہ بہت مشکل ہو نہ بہت آسان ——— اسی حد تک کامیابی اور اس کامیابی کے ذریعے جو اچھے اثرات رونما ہوتے ہیں، ان کے پیدا ہونے کا امکان ہے، اسی حد تک ہر طرح کی اچھی تعلیم کی شرائط پوری ہوں گی اور اسی حد تک کام کرنے والوں کی معقول تنظیم کے بروئے کار آنے کا امکان ہوگا۔ یہ سب باتیں کلیتہً اس تعلیمی نہج کے خلاف پڑتی ہیں جس کی رو سے طلباء صرف وہی کرتے تھے جو ان سے کرنے کو کہا جاتا تھا۔ ان دو تعلیمی طریقوں کے موازنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے درمیان جو قیمتی امتیاز ہے، وہ سامنے آجائے مگر اس کی تعبیر با ایں مفہوم نہیں کرنی چاہیئے کہ پرانے طریقے کا کوئی اچھا نتیجہ نہ نکل سکتا تھا نہ کبھی نکلا۔ اکثر اوقات واقعہ اس کے بالکل

برعکس ثابت ہوا ہی۔ عمل کے سرچشمے طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ کام کا ایک طریقہ جسے اب ہم قابلِ تنسیخ سمجھتے ہیں، کچھ لوگوں کے حق میں حوصلہ افزا ثابت ہوا ہی۔ ڈاکٹر جانسن کہا کرتے تھے: "میرے استاد مجھے بڑی بے دردی سے پیٹتے تھے، ورنہ شاید میں کچھ بھی نہ کرسکتا۔" ان کی کامیابی کا راز ان کے استاد کے اس سلوک میں مضمر تھا یا کسی اور بات میں، ضرور بحث طلب ہی۔ مگر ان کی کامیابی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قدیم طرز کو اس حد تک ہم تسلیم کرسکتے ہیں۔ ہمیں بہرحال اپنے طور پر اسی طریقۂ عمل کی حمایت کرنی چاہیئے جو کامیابی کا زیادہ سے زیادہ یقین دلائے۔ طلبار کی مصروفیت اور جوش ایسے کاموں میں جنھیں وہ اپنا ذاتی سمجھتے ہوں، ——— ہم نے دیکھا کہ یہی پہلو جدید دنیا کے ہر شعبے میں موجود ہی اور روز بروز بڑھتا جاتا ہی۔ یہی وہ حقیقت ہی جس کا نئے مدرسے کے کام پر رنگ چڑھنا چاہیئے۔ اسی سے اُس سیرت کی تعمیر ہوتی ہی جس کی ہمیں آرزو ہی۔ کام کی کوئی اور بنیاد ہمیں اس چیز کا یقین نہیں دلاتی جس کی آج کل تہذیب کو ضرورت ہی۔

مضمون کی نئی حیثیت

نئے مدرسے میں مضمون کی حیثیت اور نئے سماجی نظام سے اس کے تعلق کی طرف بالواسطہ طور پر پہلے اشارہ کیا جاچکا ہی۔ ہمارا خیال ہی کہ مضمون کا اوّلین مفہوم ہی، برتاؤ کے آداب اور طریقے، سیکھنے کی نہایت نتیجہ خیز تعبیر برتاؤ کے نئے نئے آداب کی تحصیل۔ قدیم خیال یہ تھا کہ بچپن زندگی کے ایک ضائع شدہ

دور سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے اور بہتر یہ ہے کہ اسے بلوغت کے زمانے کی اصلی زندگی کی تیاری میں صرف کیا جائے۔ اس خیال کی بنا پر لوگ کوشش کرتے تھے کہ بچوں کو وہ چیزیں فراہم کر دیں جس کی انھیں آگے چل کر ضرورت پڑیگی مگراب ہم اس طریق کار کی لغویت کو سمجھنے لگے ہیں۔ دماغ کا صحیح مصرف یہ نہیں ہے کہ اُسے غلّے کی کھتّی یا چیزوں کے گودام کی حیثیت سے استعمال کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اسے ابھی سے کام پر لگایا جائے۔ وہ کسی مہم کو چلا رہا ہو اور مسائل کے حل میں مصروف ہو جو اُس کی موجودہ کوششوں کو ابھارتے ہیں۔ اس طریقے پر پہلے کی سیکھی ہوئی باتیں اور خیالات زندہ اور بیدار رہتے ہیں۔ ہر نیا مسئلہ جو سامنے آکر حل ہو جائے، پُرانی اور نئی باتوں کا جوڑ ملا دیتا ہے اور اُس حد تک دماغ کی تعمیر ہو جاتی ہے۔ اگر یہ چیز مسلسل جاری رہے تو نشوونما میں بھی تسلسل باقی رہے گا اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، اس کا نتیجہ تجربے کی مسلسل تعمیر میں نکلتا ہے۔ طریق کار کے اس تصور کے مطابق نتیجہ خیز مضمون کی ہر مشق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تجربے کی افزائش میں ایک قدم اور آگے بڑھا۔ مضمون اس حیثیت سے نشوونما کا باعث بنتا ہے۔ اس کے برخلاف اُس درس کا قبل اس کے کہ اس کی ضرورت محسوس ہو، پڑھا دینا اسی حد تک نشوونما کے امکان کو کھونا ہے۔ نشوونما کی ٹھیک یہی مسلسل شکل ہے جس کی ہمیں اس نئی اور بدلتی ہوئی سماجی دنیا میں ضرورت ہے۔

نیا نصاب

اس طرح اب ہمارے سامنے نصاب کا ایک نیا تصور ہے۔ اس کی بنیاد مدرسے میں ہونے والے ایسے تجربات پر قائم ہے جو نہایت عمدگی کے ساتھ عام تجربے کی مسلسل تعمیر نو کو بروئے کار لاسکے گا۔ اس طرح کے تصور سے امید ہوتی ہے کہ وہ ہماری متحرک اور بدلتی ہوئی تہذیب کے مطالبات کو پورا کریگا قدیم تصور کے نزدیک تہذیب غیر متحرک اور جامد تھی اور اس کے مسائل پہلے ہی سے حل شدہ۔ تعلیم کا کام انھیں نئی نسل تک پہنچا دینا تھا۔ اس تعلیم کا نصاب بحدِ کمال گذشتہ زمانے کے حاصل کئے ہوئے حلوں کا ایک نہایت مرتب مرقع تھا۔ سیکھنے سے مراد ان نسلوں پرانے حلوں کی تحصیل تھی۔ ہر بات کو چپ چاپ تسلیم کر لینے سے "اطاعت شعاری" کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ جو جوانی کے اوصاف میں سے اعلیٰ ترین وصف مانا جاتا تھا۔ مگر اب ہمارے سامنے ایک نامعلوم مستقبل ہے۔ اب ہماری تیاری ایک بالکل مختلف انداز پر ہونی چاہیئے۔ پرانی چیزوں کا حسب ارادہ استعمال اور انھیں نئی صورت حالات کے رنگ میں رنگ لینا وہ باتیں ہیں جن پر ہمیں زور دینا چاہیئے۔ بہ حیثیت معلم کے ہمیں اپنے وجود کو نہایت فراخدلی کے ساتھ غیر ضروری بنا لینا چاہیئے۔ حال کو چاہیئے کہ اقتدار اعلیٰ کی باگ دیانت داری کے ساتھ نوخیز نسل کے ہاتھ میں دے دے مضمون اور نصاب کے نئے تصور کا مقصد اسی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ ان کی بنیاد جان بوجھ کر تبدیلی کے فلسفے پر رکھی گئی ہے۔ اُنساکی رو سے زندگی اور تعلیم

کے طریق عمل کا رُخ خود اسی طریقِ عمل کی روشنی میں ان منزلوں کی طرف پھیرا جاتا ہے جن کا تعین بالکل اسی طرح بطور خود کیا جاتا ہے۔ گویا زندگی اپنے رُخ کا تعین ماضی کی روشنی میں تو کرتی ہے مگر ماضی کی پابند ہو کر نہیں۔ وہ ماضی اور حال کو مستقبل کی حتی الامکان پیش بینی کے لئے ذریعے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ مگر زندگی حال ہی کی زندگی ہے اور حال ہی وہ دور ہے جس میں زندگی ممکن ہے۔ ذرّہ نہیں، حال کی زندگی سے مراد صرف اسی لمحے کی زندگی نہیں ہے۔ ترقی کا راز جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، چیزوں کے متعلق فیصلہ کرتے وقت اس بات میں مضمر ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کو زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل رہے۔ اس مفہوم کے مطابق حال میں زندہ رہنے سے مراد ایک وسیع حال ہے۔ وہ حال جو اپنے اندر مستقبل کو بہت بڑی حد تک مضمر رکھتا ہے، جیسے ماں بچے کو خود اپنے وجود میں مضمر رکھتی ہے اور شاید اپنے وجود کے سب سے زیادہ قیمتی جزو کی حیثیت سے۔ زندگی کا یہ تصور نہ حال کو مستقبل کا پابند کرتا ہے نہ مستقبل کو حال کا، بلکہ اول الذکر کو اس حیثیت سے دیکھتا اور اس کی قدر کرتا ہے کہ وہ نہایت سلیقے اور یقین کے ساتھ موخر الذکر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

نصاب کا یہ تصور درحقیقت اُس تصور سے بہت زیادہ مختلف ہے جو اگرچہ صدر درجہ یک رنگ ہے مگر پھر بھی رائج ہے۔ نیا نصاب تجربات پر مشتمل ہے۔ اس کے یہاں مضمون مستعمل تو ہے، مگر اس کا جزو ترکیبی نہیں ہے۔ قدیم نصاب مضمون پر مشتمل ہوتا تھا، جسے اس لئے سیکھا جاتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر اسے بجنسہٖ واپس کر دیا جائے۔ نئے نصاب کی روح بچہ ہے جو نہایت انہماک کے ساتھ کام

میں لگ رہا ہو اور اپنے موجودہ تجربے کے لئے عمل کے اچھے سے اچھے آداب کی ضرورت خود محسوس کر رہا ہو۔ عمل اور برتاؤ کے پسندیدہ طریقوں کا یہ ہی وہ دروازہ جس سے تعلیم میں مضمون داخل ہوتا ہی۔ یہ ہی وہ طریقہ جس سے ہر نئے آنے والے موقعے سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور یہ ہی وہ ڈھنگ جس پر ہماری بدلتی ہوئی دنیا اپنے نت نئے مسائل کا مقابلہ کر سکتی ہی۔ اب رہی تجربات، تو ان کی نوعیت اور رُخ کا تو پہلے سے کچھ قیاس کیا بھی جا سکتا ہی ——— بشرطیکہ وہ صحیح معنی میں تعلیمی ہوں ——— مگر ان کی قطعیت کے متعلق کوئی حکم لگانا شاذ و نادر ہی ممکن ہی۔ لہذا نصاب کا خاکہ قبل از وقت نہیں تیار کیا جا سکتا۔ البتہ استاد کے پاس اُس مواد کا پہلے سے ذخیرہ موجود رہنا چاہیئے جس کا استعمال ممکن ہی ضروری ہو، مثلاً کسی وقت معلومات کی ضرورت ہوگی، کسی وقت معلومات کے ماخذ کی اور کسی وقت موقع کی مناسبت سے ایک مخصوص طریقۂ کار کی اگر وہ میسر آسکے۔ استاد ہر وقت اپنے پاس کام کے خاکے رکھ سکتا ہی، ان کاموں کی نگرانی اور رہنمائی بھی کر سکتا ہی مگر ان سب کا مقصد ایک ہونا چاہیئے یعنی طالب علم کی تعمیر ذات۔ اس کے خاکوں کی ترتیب اس طرح پر ہونی چاہیئے کہ طلبا اپنے طے کئے ہوئے مقاصد پر قابلِ عمل حد تک زیادہ سے زیادہ اپنی ہی نگرانی اور رہنمائی میں گامزن ہوں اور ان مقاصد میں اتنی جاذب نظری ہونی چاہیئے کہ انھیں زیادہ سے زیادہ جوش اور سوجھ بوجھ کو کام میں لانے کی ضرورت پڑے۔ یہ ہی وہ چیز جس پر اُستاد کا وقت اور کوشش صرف ہونی چاہیئے نہ کہ ایک مقررہ رٹی

پر چلنے میں یا خاص خاص مضامین کو پڑھا دینے میں۔ اس طرح کے نصاب سے اس دن کے لئے زیادہ سے زیادہ مدد ملنے کا یقین ہوتا ہی جب فرد کو بالغ ہونے کے بعد ایک نامعلوم مستقبل کے لائے ہوئے نت نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس نامعلوم مستقبل سے مقابل ہونے کا گر سیکھنے کے لئے صرف یہی ایک راستہ ہی جو یقینی معلوم ہوتا ہی۔

یہاں بہت سے خیالات ایک دم آ کر مجتمع ہو جاتے ہیں۔ موجودہ نصاب جو پہلے سے مقرر کئے ہوئے مضامین پر مشتمل ہی، استاد اور شاگرد دونوں کو یکساں پابند کر دیتا ہی۔ اس نصاب نے اپنی قدیم اور انتہائی شکل میں اپنی خدمات موجودہ حالات کو بدستور قائم و برقرار رکھنے کے لئے وقف کر دی تھیں ——— اور یہ کام وہ بڑی خوبی سے انجام دیتا تھا۔ اور اسی طرح کے طرز عمل کی تعمیر کرتا تھا جو ان حالات کے مطابق ہوتے تھے خارجی سند اس کی بنیاد تھی، تقلید اس کا بنیادی تصور اور مردانہ اطاعت شعاری اس کا طریقہ۔ اپنے لئے مضمونوں کے انتخاب میں یہ تمام مروجہ اور متنازعہ فیہ مسائل سے گریز کرتا تھا (اور اگر کبھی انھیں ہاتھ میں لیتا بھی تھا تو اس وقت جب کسی مسئلے کی جانب داری اور حاکمانہ انداز میں اس تنازع کو طے کرنا مقصود ہوتا تھا، جیسا کہ بیشتر مذہب کے بارے میں دیکھا گیا ہی) قدیم علوم اور ریاضیات اس کے مذاق کی چیزیں تھیں۔ ان باتوں میں تبدیلی کو وہ اہمیت اور حیثیت حاصل نہیں تھی جو اسے آج حاصل ہی۔ جب نئی باتیں سامنے آ ہی جاتی تھیں اور انھیں کسی نوع ٹالا نہیں جا سکتا تھا تو ان

کو اس نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ ان کی نوعیت اور ساخت کیا ہے، اس نظر سے نہیں کہ ان کا عمل اور منصب کیا ہے۔ قدیم مدنیات حکومت کے ڈھچر اور دستور اساسی کی تعلیم تو دیتی تھی مگر موجودہ تنازعات و مسائل سے بہت کم کیا قطعاً کوئی سروکار نہیں رکھتی تھی۔ مگر جدید نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے۔ یہاں صرف ساخت پر نہیں، منصب پر زور دیا جاتا ہے۔ استاد اور طالب علم دونوں کے لئے غیر حل شدہ مسائل پر مل جُل کر کام کرنا مدرسے کی کوششوں میں سب سے زیادہ تعلیمی چیز ہے۔ ایسے کاموں میں ملی جُلی کوشش کا احساس ایسا محرک ہے جو ایک دوسرے کو تجویز کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ہماری آرزو ہے کہ استاد اور شاگرد اپنا نصاب خود مرتب کریں۔ ممکن ہے کسی اور نصاب کو بھی اپنا کہہ سکتے ہوں مگر یہاں اس کا مفہوم اور حیثیت بالکل نئی ہے۔

اس سلسلے میں افسوس کی ایک بات یہ ہے کہ چند مفکرین جو، یہ بات نہیں ہے کہ قدامت پرست ہوں، نہایت جدید الخیال ہیں، اگرچہ نصاب تعلیم کے مضامین کو وقت اور زمانے کے مطابق بنانے میں نہایت انہماک سے لگے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی اسی انداز میں سوچتے ہیں کہ استاد اور شاگرد دونوں کے لئے مضمون کا پہلے سے تعین کر دینا چاہیئے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ مفید مسائل اور ان کو ویسے ہی سے مربوط مواد کے عالمانہ انتخاب میں ان کی مہارت خیال کا بہت بڑا حصہ ہے، ہم بالکل اسی طرح یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ایک پڑھے لکھے اور صاحب نظر استاد کو ان منتخب موادوں کا مناسب استعمال کرنا چاہیئے مگر خالصتہً مضمون کی بنیاد پر مسئلے کو طے کرنے میں ہم ان سے

اتفاق نہیں کر سکتے۔ "مناسب استعمال" کا مفہوم ہر بات کو چپ چاپ تسلیم کر لینے کے مفہوم سے بہت زیادہ بلند ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مفکر جنھیں یونیورسٹیوں کی پروفیسری کے نہایت محترم اور معزز مرتبے حاصل ہیں، نصابِ تعلیم کے ایسے مواد کو کیسا خیال کریں گے جسے کسی ان سی بھی یا ہر شخص نے نہایت خوبی سے منظم و مرتب کر کے ان کے حوالے کر دیا ہو۔ نہیں! بہترین تعلیم کے لیے تلاش و تحقیق کا ذوق اور انتخاب کی ذمے داری نہایت ضروری ہے یا ہرین فن استادوں کو زیادہ سے زیادہ سوجھ بوجھ کے ساتھ تعلیم دیں، اگر وہ نصاب کے لیے تمام قیمتی موادوں کو جمع کرتے ہیں تو جمع کریں۔ جی ہاں، یہ سب تسلیم، مگر للّٰہ استاد کو ایک خود ارادہ اور خود فیصلہ کرنے والا انسان ہی رہنے دیجیے جو ملے جلے کام میں صرف مناسب حد تک تعاون کرے۔ فلسفی، سائنس داں، استاد، شاگرد، ہر ایک کا ایک نہ ایک معقول کردار ہے۔ ابھی ممکن ہے اکثر ایسی صورت پیش آئے کہ کچھ استادوں کو زیادہ سہارا دینے کی ضرورت پڑے۔ جہاں ایسی صورت پیش آئے، وہاں ہم ان کی ضرورت پوری کریں۔ مگر وہ چیز جس کے لیے انھیں سہارے کی ضرورت پڑے گی، اسے ہمیں نہایت فراخدلی کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے۔ یہ ثانوی درجے کا انتظام ہمیں عارضی طور پر ان چند استادوں کے لیے کرنا پڑے گا جن میں ابھی تک اپنے کام کو پورے یا مناسب طور پر چلانے کا بوتا نہیں ہے۔ لیکن جتنے جلد ہم یہ کہہ سکیں کہ معلمی کارخانے کی مزدوری نہیں بلکہ ایک علمی پیشہ ہے، اتنا ہی اچھا ہے۔ ہمارا بہت کچھ خطرے میں ہے۔ ہماری ترقی پذیر تہذیب کا مدرسے

پر اب اس قدر انحصار ہو گیا ہے کہ ہم اسے ایک دفتر کی حیثیت سے جاری نہیں رکھ سکتے جہاں صرف دستخطی کارروائی ہوتی ہے۔ معلّمی کی حیثیت اب ایک اعلیٰ آرٹ کی ہونی چاہیئے جس کی بنیاد آزادی کی فضا میں فلسفے پر بھی ہو اور سائنس پر بھی۔ صرف یہی ایک حالت ہے جسے سماج بھروسے کے ساتھ اپنی بقا کا کام سپرد کر سکتا ہے۔

نئی تعلیم اور طالب علموں پر بھروسہ کرنے کا مسئلہ

مگر طلبا کے بارے میں کیا ہے؟ —— کیا ہم اُن پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب ایک دوسرے سوال سے دیا جا سکتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے جس کی ہمیں تلاش ہے؟ کہیں ہماری خواہش یہ تو نہیں کہ ہمارے بچے وہی کچھ بنیں اور سوچیں جو ہم ان کے لئے پہلے سے مقرر کر دیں؟ کیا ان کے لئے جوابات ہم مرتب کر دیں جو اپنے مسائل سے دوچار ہوتے وقت انھیں دینے ہوں گے؟ اگر ایسا ہے تو ہم اُن پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ واقعی غور و فکر کریں گے تو انھیں وہی جوابات سوجھیں گے جو ان کے لئے ہم نے مرتب کر رکھے تھے۔ ہاں، ان میں سے بعض ان کے کام آئیں گے۔ جس صورتِ حال نے ہم کو وہ جوابات سکھائے تھے، وہ انھیں بھی سکھائے گی۔ مگر باقی جوابات! قطعاً نہیں۔ ایک صورتِ حال جس پر بلا رو رعایت غور کیا جائے، بالکل مختلف کہانی پیش کر سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم اس کے لئے راضی ہیں کہ صورتِ حال اپنا سبق خود پڑھا دے گی اور

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچّے خود سوچنا اور خود عمل کرنا سیکھیں، تو ہمیں ان پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ اگر انھیں سوچنا، فیصلہ کرنا اور ذمّے داری کے ساتھ کام کرنا سیکھنا ہی تو اس کی صرف یہی صورت ہی کہ وہ سوچنے، فیصلہ کرنے اور ذمّے داری لینے کی مشق کریں۔ تو کیا پھر ہم اپنے ہاتھ اٹھالیں اور بالکل پیچھے ہٹ جائیں۔ ہرگز نہیں۔ سیرت و اخلاق کی پذیری سے ہمارا لگاؤ رہی گا۔ ہاں یہ سوال ضرور اٹھتا ہی کہ ہماری طرف سے ان کے لئے کس قدر تحریک ہونی چاہیئے کس حد تک تجاویز آنی چاہئیں اور کتنی نگرانی ہونی چاہیئے؟ اتنی جتنی کا وہ صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر وہ مقدار کیا ہو؟ یہ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں؟ معیار وہ چیز ہی جو ہم سیکھ گئے ہوں۔ اگر ہماری تجاویز کسی بچّے کی نشو ونما کو ہمارا پابند بنا دیتی ہیں، یا اُسے ہماری جانب سے بیزار کر دیتی ہیں تو شاید اپنے کردار کو ادا کرنے میں ہم غلو کر رہی ہیں۔ ہمیں بچّے کو زیادہ آزادی اور دخل کا حق دینا چاہیئے۔ کیسی آزادی؟ کتنی آزادی ہم دے سکتے ہیں اُسی؟ یہاں بھی معیار وہ تعلیم ہی جو نتیجے میں حاصل ہوتی ہی۔ اگر بچّہ خود غرض ہو جاتا ہی اور معقول و مناسب حقائق کا لحاظ کئے بغیر فیصلے کرنے لگتا ہی تو سمجھنا چاہیئے کہ نقص ہی۔ وہ اپنے مواقع سے صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھا رہا ہی۔ شاید ہم نے اس کی کافی مدد نہیں کی یا پھر غلط طریقے پر مدد کی ہی۔ ہر صورت میں اصلاح وہاں پر ہونی چاہیئے جہاں غلطی واقع ہوئی ہی۔ مگر معیار ہمیشہ وہی چیز رہی گی جو معرضِ تحصیل میں ہی۔ سمجھ دار استاد کو آثار سے واقف رہنا ہوگا بچّے پر خوش سلیقگی کے ساتھ بھروسا کرنا تعلیم کا واحد راستہ ہی۔ اس نکتے پر

بھی نیا مدرسہ عمل پیرا رہا ہے۔ اس کا مقصد پختہ سیرت، جماعت پسند، اور خود اختیار انسان کی تعمیر ہے۔ اس کام کے لئے وہ بچے پر بھروسہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر یہ کیوں کہیے کہ "بچے پر بھروسہ کرنے کی کوشش کرتا ہے" کوشش کیوں کیجیے۔ جواب یہ ہے کہ تعلیم سرے سے تجربی چیز ہے۔ معمولاً ہر بچہ اس قدر پیچیدہ، اور غیر محدود ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کیا کرے گا۔ حدود کے اندر پیش بینی کرنا، تسلیم، مگر ٹھیک ٹھیک اور قطعیت کے ساتھ علم ہونا سراسر غلط۔ اس لحاظ سے تعلیم کے مقاصد کے بارے میں یوں سمجھئے کہ ہمارا واسطہ غیر محدود امکانات سے ہے۔ یہ مقاصد ایک دوسرے سے متضاد بھی بیان ہو سکتے ہیں، متضاد یا بہ الفاظ دیگر ایک دوسرے کی اصلاح کرنے والے۔ ہمارے مرکزِ آرزو ایسے پختہ سیرت انسان ہیں جو اپنے ایمانداری سے قائم کئے ہوئے عقیدوں پر جمے رہیں، اور ساتھ ہی ساتھ باہم ایسا تعاون جس کی بنیاد خوش معاملگی پر ہو۔ عقیدے کی پختگی اور تعاون کے لئے لازم ہے کہ ہر ایک دوسرے کے لئے حدود مقرر کرے۔ دونوں میں سے ہر ایک کا کتنا حصہ ہو، اس کے لئے نہ کوئی مقررہ مقدار ہے نہ تناسب، ہم اس اخلاقی دنیا کو ریاضی کے اصول پر نہیں چلا سکتے۔ ہم جو کچھ بھی مدرسے میں کرتے ہیں، اُسے بوجوہ گھٹاتے گھٹاتے رٹائی کی حد تک نہیں لایا جا سکتا۔ اسے زندگی کے ساتھ ساتھ تجربی ہی رہنا چاہئے۔ نیا مدرسہ بچے پر بھروسہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور علم اور مہارت کی ترقی کے ساتھ اس پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ جب ہم چار سو

بچوں میں پچھتر بید روزانہ کے زمانے کا تصور کرتے ہیں، جسے ابھی لے دیکر کُل ستر سال ہوئے تو ہمیں اپنی ترقی پر خوشی ہوتی ہے۔ تعلیم بہت آگے نکل چکی ہے۔ ہم نے سیکھ لیا ہے کہ بچے پر کس طرح بھروسہ کرنا چاہیئے۔ لیکن پھر بھی ابھی ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ آج بھی بیشتر مدرسے اچھے مدرسوں سے بہت پیچھے ہیں اور اچھے مدرسے بے معنی اور خواہ مخواہ کے اندیشوں سے آگے قدم بڑھانے سے رہ جاتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ ایک نیا فلسفہ اور ایک نیا علم النفس رات کی رات اُن کے نتائج پر غور نہیں کرسکتا اور نہ ان کے لئے مربوط و مشترکہ لائحہ عمل ترتیب دے سکتا ہے۔ ابھی کافی سوچ بچار اور تجربے کی ضرورت ہے۔ عملِ ایجاد دراصل ایک ابدی النوع چیز ہے۔ لہذا جس چیز کے لئے ہمارا سوال ہے، وہ ہے فکر اور تجربے کا موقع۔ اگر تہذیب کا تعلیم پر انحصار ہے ———— اور یقیناً ہے ———— تو ہماری کوشش تائید و حمایت کی حقدار اور اس پر جو کچھ خرچ آئے اس کی مستحق ہے۔

تعلیم کا منتہائے نظر

چلتے چلاتے ایک اور بات! جب تک ہمیں تعلیم کی آخری منزل نہ معلوم ہو اس وقت تک بڑھانا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن، وہ منتہائے نظر کیا ہے؟ ہم انسانی شخصیت پر کس نظر سے غور کریں؟ قدیم فلسفوں نے اس منتہائے نظر کا احساس کسی خارجی دنیا میں کیا تھا۔ جب وہ مقصد یا منتہا کا تعین کرنے لگتے

تھے تو ان کی نظر اصل زندگی سے قطعاً الگ کہیں خارج میں ہوتی تھی اور اگر یہ نہیں تو سیکھنے والے کی زندگی سے اس کا بے تعلق ہونا تو مسلّم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سیکھنے والے کی حیثیت اس خارجی مقصد کے ایک ذریعے کی ہوتی تھی۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ وہ اور اس کی زندگی اسی حد تک بے جان اور کم مایہ رہ جاتی تھی۔ اس خارجی مقصد کا مفہوم ممکن ہے، قدیم علماء الٰہیات یا پیورٹن (PURITANS) کے نزدیک حیات بعد الموت رہا ہو یا دوسروں کے نزدیک سلطنت کا عروج و اقتدار یا کسی شاہی خاندان کا دوام، کسی خاص نظریے کی بقا، یا کسی ممتاز قوم کی عظمت۔ ہر صورت میں تعلیم کی رسوائی ہوتی ہے اور وہ روزِ ازل سے مقدر کیے ہوئے چند عادات و اطوار کی ٹریننگ بن جاتی ہے۔ ایک مخصوص اور منتخب مذہبِ فکر کی تلقین و تبلیغ، اور فرد اپنی ذاتی شخصیت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس قسم کا کوئی مقصد یا منہاج ہمیشہ کے لئے اطمینان بخش نہیں ہو سکتا۔ انسان کی پہلے سے زیادہ حساس طبیعت اسے روز بروز منسوخ کرتی جاتی ہے۔ اس طریقِ فکر کے ماتحت مقصد کے طور پر جہاں تک اس کے سمجھ میں آنے کا تعلق ہے ہمارے سامنے انسان کی وہ قسم ہوگی جو اپنے آپ سوچنے اور فیصلہ کرنے کی جانب راغب اور اس کی اہل ہو، جو تعصب اور رعایت کے پھندے سے نکل کر آزادانہ طور پر سوچ سکے، جس کے فیصلے بے غرضانہ ہوں اور جو سماجی مفاد کو محض ذاتی مفاد یا نفع پر مقدم رکھے۔ غرض جس مقصد کو ہم تسلیم کر سکتے ہیں وہ صرف وہ مقصد ہے جس کے یہاں شخصیت کی قدر ہو۔

لیکن ایک مزید نقطۂ نظر اور بھی ہے، زندگی کے دو نمونوں کے درمیان

موازنہ اور انتخاب۔ کیا وہ دونوں قدر و قیمت کے لحاظ سے ایک ہی معیار کے ہیں یا ایک دوسرے سے بہتر ہے؟ آپ پس و پیش میں پڑ گئے۔" سوچنے کا جو میرا انداز ہے، اس لحاظ سے تو یہ اس سے بہتر ہے۔ مگر میرے معیار غلط ہو سکتے ہیں میں کیا جانتا ہوں؟ آپ کا تذبذب بجا ہے۔ آپ نہیں جانتے۔" جاننا" ذرا مشکل سا لفظ ہے۔ آپ غلطی پر ہو سکتے ہیں۔ مگر گھبرایئے نہیں۔ وہیں سے چلئے جہاں آپ ہیں اپنی موجودہ معیاروں کو مفروضہ قرار دیجئے۔ اور انھیں زندگی کے دوسرے نمونوں پر آزمایئے۔ تاریخ کی روشنی میں پرکھئے۔ باہر آکر تجربات کی کسوٹی پر جانچئے اپنی مدد اور اپنے نتائج پر تنقید کرنے اور فیصلہ دینے کے لئے دوسرے معیاروں کو دعوت دیجئے۔ نتیجے میں نکلے ہوئے حقائق کے حسب منشاء اپنے مفروضات بدل دیجئے۔ اسی عمل کو جاری رکھئے۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ نہ آپ سے اور نہ پوری دنیا سے۔ آپ کے معیار آخر تک مفروضات ہی کی شکل میں رہیں گے ——— اور انھیں اسی طرح رہنا چاہیئے ———

یہ کیفیت ہے اس دنیا کی جس میں ہم رہتے ہیں۔ اور ایسا ہی اسے ہونا تھا جب معاملات میں رکاؤ آجاتا ہے اور یہ رکاؤ بہت زمانے تک قائم رہتا ہے تو لوگ اپنے معیاروں کی فرضی نوعیت کو آسانی سے بھول جاتے ہیں۔ اور جب چیزوں میں تیزی سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے جیسی کہ آج کل ہو رہی ہے تو یہ حقیقت آسانی سے نظر آجاتی ہے اس لئے کہ معاملات کی تبدیلیاں بڑی شدت کے ساتھ اس کی مقتضی ہوتی ہیں کہ ہمارے خیالات میں بھی تبدیلی پیدا ہو۔ اور کیا آپ کا خیال ہے کہ اس لا متناہی سلسلۂ تحقیق کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا؟ اس باب میں

ہم قطعی اور آخری طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے مگر بشرطیکہ تجربہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے اس میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اس کتاب کے پسِ پشت یہ مفروضہ ہے کہ عملِ حیات بعض حیثیتوں سے اچھا ہے اور سوچ سمجھ کر کوشش کرنے سے اُسے اور اچھا بنایا جا سکتا ہے۔ اُسے بہتر بنانے کی ایسی ہر کوشش اپنے اندر تعلیمی تاثیر رکھتی ہے۔ تعلیم کے سامنے جو منزل ہے، وہ ہے فکر و عمل کے ذریعے، عملِ حیات میں تسلسل رکھنا اور اس میں اضافہ کرنا اور مزید برآں یہی چیز ہماری تعلیم بھی ہے۔ اس طرح تعلیم زندگی کا جزو بھی ہے اور اس کے لئے ذریعہ بھی اس کا مقصد بہ حالتِ عمل داخلی ہے۔ اس طرح کا مقصد وہ واحد مقصد ہے جو ایک نمو پذیر دنیا کے لئے مناسب ہے۔ مسلسل نمو اس کی روح ہے اور اس کا منتہائے نظر[1]

ایک نئے فلسفۂ تعلیم کی ضرورت

ایسی حالت میں کہ دنیا نہایت تیزی سے بدل رہی ہے، فلسفے کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنی بنیاد تبدیلی پر رکھے یا یہ تسلیم کرے کہ امورِ حیات میں اس کی حیثیت ایک محرکِ عمل کی نہیں ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب ایک کوشش ہے ایک ایسے فلسفۂ تعلیم کا خاکہ تیار کرنے کی جو اس نقطۂ نظر کے مطابق ہماری بدلتی دنیا کے لئے موزوں ہو۔ اس کا ایک مقصد ان خاص رجحاناتِ فکر کی طرف

---

[1] ملاحظہ ہو جان ڈوئی کی کتاب جمہوریت اور تعلیم باب چہارم۔

آپ کی توجہ مبذول کراتا ہو جو اس وقت بھی ہمارے درمیان عمل پیرا ہیں۔ ان میں سے چند کے سامنے تو مستقبل ہی اور باقی کی نظر پیچھے کی طرف ہی۔ یہ موخرالذکر رجحانات چونکہ ایک دیرینہ جامدالنوع نظام اشیاء کے باقیات ہیں اس لئے ہماری مدد کرنے کے بجائے ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہی اگرچہ افسوسناک، کہ ہمارے روایتی مدارس میں سے بیشتر کے فکر اور طریقۂ عمل کی بنیاد زندگی کے معاملے میں اسی قدیم اور جامد نقطۂ نظر پر ہی۔ اس قسم کے الفاظ مثلاً لکھنا، پڑھنا، مطالعہ مضمون، نصاب، ترقی، درسی کتاب، مقاصد، نمونے مع اپنے اپنے خصوصی طریقہ عمل کے اسی جامدالنوع نقطۂ نظر کو ادا کرتے ہیں اور اس طرح جب ان پر کبھی کوئی بحث ہوتی ہی، تو اسے پہلے ہی سے تعصب کا رنگ دے دیتے ہیں۔ اگر یہ بحث روایات کے اس مورچے کو توڑنے میں ممد ثابت ہو تو ایک اور مقصد پورا ہو جائے گا۔ فکر اور طریقۂ کار کے دوسرے رجحانات جو ہمارے درمیان نظر آتے ہیں، یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ مدرسہ اپنے اندر مزید جذب و قبول کی صلاحیت پیدا کرے۔ ان رجحانات کا مطالبہ ہی کہ ہم ان کی توجیہہ طلب طبیعت کا زیادہ سے زیادہ پاس رکھیں۔ اگر یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے تو انھیں زیادہ سوجھ بوجھ اور لہٰذا موثر انداز میں پڑھایا جا سکتا ہی۔ اگر اس سلسلے میں ہماری یہ بحث کام آسکے تو ایک مزید مقصد کی تکمیل ہو جائے گی۔ تعلیم کے فلسفے اور کوشش کی تعمیر نو کا کام اس طرح پر کہ موجودہ ضروریات سے اس کا جوڑ مل جائے، بہت بڑا ہی۔ یہ کام جب بہت سے لوگ مل کر کوشش کریں گے، تب کہیں جا کر پورا ہو گا۔ اس کتاب

کا انداز غیر اصطلاحی اس امید میں رکھا گیا ہی، کہ وہ حضرات وخواتین جن پر امور عالم کی ذمے داری ہی، ہمارے مدرسوں کی تبدیلیوں کے اسباب وعلل کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ ان تبدیلیوں پر بہت سے لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا ہی، کچھ لوگ ان سے خوف کھا رہے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے ان کا مضحکہ اڑایا ہی۔ اگر مدرسہ ہماری روز بروز بڑھنے والی تہذیب کے قدم بہ قدم چلنے کے بجائے، مستقل طور پر اس سے پیچھے رہا تو یہ اس کے لیے بڑی خطرناک صورت ہوگی۔ نئے مدرسے کو پرانے مدارس سے بنیادی طور پر مختلف ہونا چاہیے۔ اس تعلیم پر خرچ نسبتاً زیادہ آئے گا، محض عمارات اور ساز وسامان کا خرچ نہیں بلکہ ان مردوں اور عورتوں کا جو ان عمارتوں اور اس ساز وسامان کو استعمال کرینگے۔ بڑی بڑی قیمتی عمارتیں چونکہ دورِ حاضر کے مذاق ومزاج سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے وہ آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں، مگر جس قسم کے افسروں اور استادوں کی ضرورت ہی، ان کا حاصل ہونا نسبتاً مشکل ہی۔ ہمیں بہرحال جس چیز کی ضرورت ہی اور جسے ہمیں بہر نوع حاصل کرنا چاہیے، وہ ہی دماغ تعلیم اور سیرت، اور ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے فلسفے کی تبدیلی ہی بظاہر وہ ذریعہ ہی جس سے ہمیں کامل امید ہوتی ہی۔ ایک ایسی ہی تبدیلیٔ نظر جو ہمارے عہد کی بنیادی نوعیت اور ایک اچھی تعلیم کے لیے اس کی اشد ضرورت کا ادراک کر سکے، جمہور سے معقول تائید وحمایت کی امید کر سکتی ہی۔ ہمیں جس قابلیت اور سیرت کے لوگوں کی ضرورت ہی، ان کے لیے کشش کا سبب روپے پیسے سے بھی زیادہ ایک اچھا فلسفہ ہوگا جو تعلیم کو اس کی ذاتی غلامی سے آزاد

کرے اور اسے بلا روک ٹوک اپنا اصلی کام انجام دینے دے۔ اس طرح جب وہ
آزاد ہو جائے گی اور اسے جمہور کی مقبولیت اور تائید حاصل ہوگی، تب جا کر اس کا
اصلی جوہر اور حقیقی منصب کھلے گا ——————— اور وہ جوہر اور منصب
کیا ہے، ایک اچھی تہذیب کی معماری اور اس کا سپاہیانہ دفاع۔ اور یہ ہے
وہ مقام جہاں حسب دستور خیال کی تبدیلی کو آگے بڑھنا چاہیئے اور اس کی
رہنمائی کرنا چاہیئے۔